آنکھوں سے دل تک
ڈاکٹر رینو بہل

آنکھوں سے دِل تک

ڈاکٹر رینو بہل

نام	: ڈاکٹر رینو بہل
والد کا نام	: سورگیہ شری اے۔سی۔بہل
تاریخِ پیدائش	: ۶/اگست ۱۹۵۸ء
پتہ	: 1505، سیکٹر-B-49، چنڈی گڑھ-160047
تعلیمی لیاقت	: ایم۔اے (پبلک ایڈمنسٹریشن) ایم۔اے (پولیٹکل سائنس) ایم۔اے (اُردو) (گولڈ میڈلسٹ) پی۔ایچ۔ڈی (۲۰۰۰ء) بعنوان: ''عصمت چغتائی کے افسانوں کا فنی وفکری جائزہ'' پنجاب یونیورسٹی، چنڈی گڑھ سے
ادبی خدمات	: • ۱۹۹۶ء سے اُردو میں متواتر کہانیاں لکھ رہی ہیں جو ملک کے مؤقر جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں • ۲۰۰۱ء میں اُردو کہانیوں کا مجموعہ ''آئینہ'' کے عنوان سے شائع ہوا جسے یو۔پی اُردو اکادمی نے انعام سے نوازا • ۲۰۰۳ء میں لالہ جگت نارائن ایوارڈ سے بھی نوازی جا چکی ہیں

یہ کتاب بھاشا وِبھاگ پنجاب کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

MODERN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23278869

AANKHON SE DIL TAK *(Short Stories)*
By: Dr. Renu Behl

Rs. 150/-
2005

آنکھوں سے دِل تک

(افسانوں کا مجموعہ)

ڈاکٹر رینو بہل

ماڈرن پبلشنگ ہاؤس

۹- گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۲

سنِ اشاعت : ۲۰۰۵ء
تعداد : ۱۰۰۰
قیمت : ایک سو پچاس روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق : وجے گرافکس
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2

ISBN 81-8042-091-4

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

فہرست

باصر افسانہ نگار

۱۹۵۰ء کی دہائی میں لیتھو پریس میں چھپا چار سو صفحات پر مشتمل ایک ناول بازار میں آیا۔ نام تھا ''تصویر''۔ مصنفہ تھیں اے۔آر۔خاتون۔ ہاتھوں ہاتھ وہ ناول فروخت ہوگیا حالانکہ اُس کی قیمت چار روپے تھی جو اُس وقت کے لحاظ سے زیادہ تھی۔ بہر کیف کہانی کے شوقین تعلیم یافتہ مسلم گھرانوں کو ''تصویر'' نے اپنی طرف اتنا کھینچا کہ اے۔آر۔خاتون نے جلد ہی ''شمع'' روشن کردی۔ قاری کو پانچ سو لیتھو صفحات پر پھیلی ''شمع'' نے ایسا سمیٹا کہ جلد ہی مصنفہ کو سات سو صفحات پر ''افشاں'' بکھیرنا پڑی۔ ''تصویر''، ''شمع'' اور ''افشاں'' کی جیسی پذیرائی ہوئی ویسی پذیرائی اس سے قبل صرف منشی فیاض علی کے ''انور'' اور ''شمیم'' کی ہی ہوئی تھی۔ اے۔آر۔خاتون کے تینوں ناول ایک بے حد خوبصورت اور جوان لڑکی سے شروع ہوکر اُس کی شادی پر ختم ہوجاتے ہیں۔ بہرحال ''تصویر'' اتنی خوب صورت، ''شمع'' اتنی روشن اور ''افشاں'' اتنی چمک دار ثابت ہوئی کہ کتنی ہی مسلم خواتین نے قلم اُٹھالیا اور ایسے ناولوں اور افسانوں کی ایک وبا پھیل گئی جو ایک بے حد خوبصورت جوان لڑکی سے شروع ہوکر اُس کی شادی پر ختم ہوتے تھے۔ عصمت چغتائی، واجدہ تبسّم اور رضیہ سجّاد ظہیر جیسی معدودے چند ناول نگار اور افسانہ نگار خواتین کی اس بھیڑ سے الگ رہیں، اس وبا کی چپیٹ میں نہیں آئیں۔ یہ وبا بڑی حد تک آج بھی پھیلی ہوئی ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ آج جب دُنیا تیزی سے سمٹتی سکڑتی جارہی ہے، جہاں برق رفتار تغیّر و جدید آگہی سے استعجاب میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے اور تجسّس میں بھی، جہاں مسائل زدہ زندگی روزافزوں زیادہ سے زیادہ مشکل (Complicated) ہوتی جارہی ہے، اُردو کی بیشتر افسانہ نگار خواتین (اور متعدّد افسانہ نگار حضرات) کے افسانے آج بھی ایک خوب صورت جوان لڑکی سے شروع ہوکر اس کی شادی پر ختم ہورہے ہیں۔ کہتے ہیں افسانہ نگار صاحبِ بصیرت ہوتا ہے، ہماری اِن بصیر افسانہ نگاروں کی بصیرت ایک خوب صورت جوان لڑکی کی شادی تک

محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ترس آتا ہے ایسی نام نہاد افسانہ نگاروں پر۔

لیکن حالات مایوس کن نہیں ہیں۔ کچھ خواتین آج بھی اس بھیڑ سے الگ ہیں، جن کی نگاہ انسانی سماج پر ہے، اس سماج کے افراد پر ہے جو اپنی تمام اچھّائیوں، تمام برائیوں، تمام خوبیوں، تمام خامیوں، تمام اُلجھنوں، تمام مسائل، تمام خوشیوں، تمام غموں کے ساتھ اپنے اپنے طریقے سے اپنی اپنی زندگی، اپنا اپنا حال، اپنے اپنے لمحات جی رہے ہیں۔ ایسی گنی چنی باصرا افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں اور اہم نام ڈاکٹر رینو بہل کا ہے۔

غالباً ۱۹۹۷ء یا ۱۹۹۸ء میں میں نے پہلی بار رینو بہل کو پڑھا تھا۔ اب یہ یاد نہیں کہ کس رسالے میں اُن کا افسانہ پڑھا تھا۔ افسانے کا عنوان کیا تھا، صرف یہ یاد ہے کہ یہ چونکہ ایک نیا نام تھا اس لیے افسانے نے متوجہ کیا تھا، اور یہ بھی یاد ہے کہ افسانہ پڑھ کر متاثر بھی ہوا تھا، زبان کی سادگی و روانی اور موضوع کے ساتھ اُن کے ٹریٹمنٹ نے انھیں ایک الگ پن، ایک انفرادیت دی تھی۔ یہ سادہ بیانی اور زبان کی دلکش روانی، تیز موضوع کے ساتھ پرخلوص لیکن غیر جانبدارانہ ٹریٹمنٹ رینو بہل کے افسانوں میں آج بھی جاری ہے۔

رینو بہل نے عورتوں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی عورت یا تو مرکزی کردار ہے، یا اہم ترین کردار، جو پوری کہانی میں رچی ہوئی ہے۔ کہانی کے تمام واقعات سے اس کا قریبی اور گہرا رِشتہ ہے۔ عورت رینو بہل کی کہانیوں میں تحرک کا سرچشمہ ہے۔ اُن کی جو بھی کہانیاں میں نے پڑھی ہیں، اُن میں ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ مصنّفہ نے اپنی کسی بھی کہانی میں کسی عورت سے کچھ کروایا نہیں ہے،...... بس سماج کے کسی حصّے، کسی گوشے، کسی گھر سے انھوں نے ایک عورت کو اُٹھا کر اپنے افسانے میں اس طرح چھوڑ دیا ہے کہ اسے عمل کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ اُن کی کہانی میں عورت اپنی راہ کا ہی تعیّن نہیں، بلکہ اُس راہ پر اپنے اندازِ خرام کا تعیّن بھی خود ہی کرتی نظر آتی ہے۔ افسانہ نگار نے ان کرداروں کے افکار و افعال کو، اور اُن کے ردِ عمل میں وقوع پذیر ہونے والی خوشیوں، غموں، مسئلوں اور اُلجھنوں کو بڑی سادہ زبان میں پوری دیانتداری اور قطعی غیر جانبداری کے ساتھ کھُل کر رقم کر دیا ہے۔

رینو بہل کی کہانیوں کی نِسا اچھی و بُری، بامراد و نامراد، طاقت ور و کم زور، خوب صورت و بدصورت، ذہین و کند ذہن، مال دار و مسکین، دانا و نادان، شاد و ناشاد، منکسر و مغرور افراد ہیں۔ ہر کردار ایک مختلف فرد ہے...... کسی بھی کردار میں رینو بہل خود کہیں پر نہیں ہیں۔ افسانہ تخلیق

کرتے ہوئے، خاص کر کردار سازی کرتے ہوئے اپنے کو لا تعلق، ناوابستہ اور قطعی غیر جانبدار رکھ پانا بڑی بات ہے۔

رینو بہل کی کہانیاں پڑھنے کے لیے دل پر جبر نہیں کرنا پڑتا۔ کہانیاں خود کو پڑھوا لیتی ہیں۔ کم الفاظ میں بہت کچھ کہہ جانا، اور مشکل سے مشکل بات کو بھی بڑی آسان زبان میں کہہ جانا ان کا اسلوب ہے:

''واحد مرد ہونے کی وجہ سے اور بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے ساری ذمّے داری مجھ پر آن پڑی۔ مجھ پر عورتوں کی ذمّے داری کا بوجھ اتنا تھا کہ جوانی کا رنگ مجھ پر چڑھ ہی نہ سکا۔ دوسرے لڑکوں کی طرح نہ ہی میں کہیں آنکھ لڑا سکا اور نہ ہی باپ کے مال پر عیش کر سکا۔''

یا:

''اس میں تمھارا یا میرا کوئی قصور نہیں۔ زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے۔ مغربی تہذیب کا اثر نوجوانوں پر زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ جو والدین اس ماحول میں ڈھل گئے ہیں وہی سکھی ہیں۔ ہمارے جیسے، جو اپنی تہذیب نہیں بھول پائے، پریشان ہو رہے ہیں۔''

اس طرح یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ رینو بہل کے یہاں جو کچھ ہے وہ معاشرے سے لیا گیا ہے۔ عصری حسیّت اُن کے افسانوں میں بڑی وضاحت سے نمایاں ہے:

''یہ بے حس دہشت گرد تو اپنا کام کر کے آگے نکل جاتے ہیں، مگر اپنی بے رحمی کے نقش ہمیشہ کے لیے اُن لوگوں کے دِل و دماغ پر چھوڑ جاتے ہیں جو آدھے ادھورے زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ ایک آدمی کو نہیں بلکہ اُس سے وابستہ کئی دوسرے لوگوں کو بھی جیتے جی مار جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ ایک مرنے والے کے ساتھ کتنے لوگ مر گئے۔''

بگڑے ہوئے حالات اور اُن کے بگڑنے کے اسباب کا جائزہ بھی وہ بڑی باریکی سے لیتی ہیں اور ان کا تجزیہ بھی بڑے سلیقے سے کرتی ہیں:

''میں دُنیا بھر کا سکھ اپنی اولاد کو دینا چاہتا تھا، اسی لیے زیادہ دولت کمانے کے چکّر میں یہ بھول گیا کہ ہر سکھ پیسے سے نہیں خریدا جا سکتا۔ بچّے کو پیسے کی نہیں وقت کی

ضرورت ہوتی ہے۔ ماں اسے لاڈ پیار تو دیتی رہی مگر اس کی خامیوں کو نظر انداز کرتی رہی، اس پر پردہ ڈالتی رہی۔ میں اسے وقت نہ دے سکا اور ماں ٹھیک سے راہنمائی نہ کر سکی۔ آج حالات بگڑ گئے تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے مگر میری بیٹی کے پاس ہمارے لیے وقت نہیں۔ کل وہ میرا انتظار کرتی تھی، آج میں اس کا انتظار کرتا ہوں۔ اس کے لوٹنے کا انتظار کرتا ہوں۔''

اس طرح رینو بہل حقیقتوں سے فرار اختیار کرتی ہوئی نہیں بلکہ حقیقتوں سے نبرد آزما ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اپنے ہر افسانے میں وہ کسی اُلجھن کا نظارہ کرتی ہوئی اور پھر اُس اُلجھن کے اسباب کی تلاش میں سرگرداں دِکھائی دیتی ہیں۔ یہ ''کیوں ہے؟'' کی تلاش ان کے افسانوں کو حسن بھی عطا کرتی ہے، وزن بھی۔

رِشتوں اور نفسیاتی اُلجھاوؤں، اور کہانی پن سے لبریز افسانہ 'سراب'۔ جذباتی نادانیوں کا افسانہ 'فاصلے'۔ جذبات کی وقتی پائداری اور قوانینِ قدرت کے مستقل استحکام کے تصادم کا افسانہ 'چٹکی بھر سندور' اور انسانی اور حیوانی رجحانوں کا نہیں بلکہ حیوانی اور ناحیوانی رُجحانوں کا افسانہ ''کوکھ جلی'' وہ افسانے ہیں جنھیں پڑھ کر بڑے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ رینو بہل کا حال تابناک ہے، مستقبل مزید تابناک۔

——اقبال انصاری

۲۸ / جنوری ۲۰۰۵ء

دہلی

لمحوں نے خطا کی صدیوں نے سزا پائی

''بابو صاحب مبارک ہو، سنا ہے ۱۵/ اگست کو آپ بھی رہا ہو رہے ہیں۔''
رام سنگھ جیسا خونخوار قیدی بھی اسے عزّت سے بابو صاحب کہا کرتا تھا۔
''سنا تو کچھ ایسا میں نے بھی ہے۔'' پرمود بابو نے بجھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ شروع شروع میں دوسرے قیدی اسے اس کے نمبر سے بلاتے تھے اور جب لوگ اسے اچھی طرح سے جاننے لگے تو وہ نمبر ۲۲۰ سے پرمود بابو بن گیا۔ قیدیوں کی حق کی لڑائی لڑنے سے وہ ان سب کا مسیحا ہو گیا۔ پرمود خود ایک پولیس انسپکٹر رہ چکا تھا اس لیے وہ قانون کی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف تھا اور اسی کا فائدہ وہ اپنے قیدی بھائیوں کو دلاتا رہتا۔ جب بھی کسی کو کوئی مصیبت آن پڑتی تو وہ بھاگ کر اس کے پاس آتے کیونکہ انھیں اس بات کا یقین ہوتا کہ وہ اُن کی مدد ضرور کرے گا۔ وہ کبھی کسی کو مایوس نہیں کرتا۔
''ایک بات اپنے بھیجے میں اب تک نہیں پڑی کہ جو انسان چیونٹی کو مسلنے سے بھی ڈرتا ہے وہ کسی آدمی کا خون کیسے کر سکتا ہے؟ آپ کو جاننے والا کوئی بھی اس بات کو ہضم نہیں کر سکتا۔''
''رام سنگھ میرے بھائی! جب انسان کا وقت بُرا آتا ہے تو اس کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے اور جب آدمی میں 'میں' سما جاتی ہے تو اسے بھلے برے کی تمیز نہیں رہتی۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے اور میں راستے سے بھٹک گیا۔ نتیجہ تمھارے سامنے ہے۔'' اس کی آواز جیسے کہیں دُور سے آ رہی تھی۔
''گستاخی معاف ہو بابو صاحب ہم آج تک قتل کا سبب نہیں جان پائے۔ آپ رِہا ہو کر چلے جائیں گے تو ہمارے ذہن میں یہ کیڑا ہمیشہ پلتا رہے گا کہ وہ کیا وجہ تھی جس کے لیے آپ کو عمر قید کاٹنی پڑی۔''

''لگتا ہے آج پیچھا نہیں چھوڑنے والے۔''

''مجھ جیسے درندے کے سوئے ہوئے ضمیر کو بھی آپ نے جگا دیا۔ کئی بھٹکے ہوئے لوگوں کو آپ نے صحیح راہ دکھائی۔ آپ کے بارے میں جاننے کا پورا حق ہے ہمیں۔''

رام سنگھ کے پیار، ضد اور اپنے پن کی وجہ سے اسے بند زبان کھولنی پڑی۔ ماضی کے اوراق پلٹے جانے لگے اور وہ تقریباً بیس سال پیچھے پہنچ گیا۔

''بات ان دنوں کی ہے جب میری شادی کی بات انجلی سے چل رہی تھی۔ انجلی میرے والد کے دوست کی بیٹی تھی۔ ہم لوگ ہماچل کے رہنے والے ہیں۔ انجلی کے والد سجان پور چھوڑ کر دلی جا بسے تھے۔ ان کا وہاں اچھا خاصہ کاروبار تھا۔ میرے والد سجان پور میں ہی اسکول ماسٹر تھے۔ سجان پور پہاڑیوں میں بسا ایک چھوٹا سا خوبصورت اور شانت قصبہ ہے۔ قدرت کے دلکش نظاروں کی طرح وہاں کے لوگ بھی بہت سادہ، صاف دل اور خوبصورت ہیں۔ ایک معمولی اسکول ماسٹر کی بھی وہاں اتنی عزت تھی کہ شہر میں کسی کلکٹر کی بھی نہ ہو۔ ماسٹر تاراچند کے منہ سے نکلا کام منٹوں میں پورا ہوتا تھا۔ ان کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی پوری توجہ مجھ پر رہی۔ نہ صرف انھیں بلکہ وہاں کے لوگوں کو بھی مجھ سے بہت اُمید تھی۔ اسکول کی پڑھائی مکمل ہونے پر انھوں نے میرا داخلہ چنڈی گڑھ کے نامی کالج میں کروا دیا۔ اتنے بڑے کالج اور ہاسٹل کا خرچ اٹھا پانا ان کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ انھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر میرے اخراجات پورے کیے۔ میں نے بھی خود کو چنڈی گڑھ کے مغربی ماحول کے اثر میں بسنے والے شہر کی ہوا سے بچا کر رکھا اور پوری توجہ پڑھائی پر دی۔ میں نے سوچا تھا کہ پڑھائی مکمل ہوتے ہی مجھے نوکری مل جائے گی مگر میں اس دیش میں اکیلا پڑھا لکھا تو تھا نہیں جو پلیٹ میں سجا کر مجھے نوکری مل جاتی۔ آخر کار پولیس محکمہ میں انسپکٹر کی نوکری پر میرے نام کی مہر لگی ہوئی تھی۔ Competition پاس کیا تو جا کر یہ نوکری نصیب ہوئی۔ ماں اور بابو جی بھی خوش تھے۔ میں نے اپنی پہلی ڈیوٹی چنڈی گڑھ میں ہی جوائن کی۔ بابو جی۔ نے نوکری جوائن کرنے سے پہلے دو نصیحتیں کی تھیں۔

''بیٹا تم میری زندگی بھر کی کمائی ہو اور میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ایمانداری کے رزق میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا اور کبھی کسی بے گناہ پر ظلم مت کرنا۔ کرسی کا نشہ بہت بُرا ہوتا ہے ہمیشہ انصاف کا ساتھ دینا۔''

''بس آپ کا آشیرواد چاہیے بابو جی۔ میں آپ کی یہ باتیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

ان سے وعدہ کر کے میں چلا تو گیا مگر کرسی کی طاقت نے مجھے سب بھلا دیا۔ میری خوشی ہی میری بدنصیبی بن گئی۔

نوکری لگتے ہی رشتے آنے شروع ہو گئے۔ جب بھی گھر جاتا ماں لڑکیوں کی تصویریں سامنے رکھ دیتی اور چھٹیاں ان ہی باتوں میں کٹ جاتیں۔ اس روز جب میں گھر پہنچا تو ماں کے علاوہ بابو جی کے پاس بھی ایک رشتہ تھا۔

''میں تو تجھے تصویریں بعد میں دکھاؤں گی پہلے تو اپنے بابو جی سے بات کر لے۔''

بابو جی چاہتے تھے کہ میں انجلی سے شادی کرلوں۔ انجلی اچھے گھر کی پڑھی لکھی لڑکی تھی مگر میں ڈرتا تھا کہ وہ امیر خاندان کی لڑکی ہے اس کے ماحول اور میرے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہماری پرورش میں فرق ہے۔ معلوم نہیں وہ ہمارے گھر میں خود کو ایڈجسٹ کر پائے گی کہ نہیں۔ مگر ماں اور بابو جی کو لڑکی بہت پسند تھی۔ وہ تو بس ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھے۔

''میں اس خاندان کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ وہ لوگ نہایت ہی شریف اور سادہ زندگی گزارنے والے ہیں۔ پیسے کی ذرا بھی بُو نہیں ہے ان میں۔ اور پھر ہم بھی کوئی گرے پڑے تو ہیں نہیں۔ بس تو جلدی سے ہاں کر دے۔''

نا کی کوئی گنجائش بچی ہی نہیں۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔ دوستی رشتے داری میں بدل گئی۔ انجلی کے والد اس لیے خوش تھے کہ پھر سے وہ اپنی جڑوں سے جڑنے کی کوشش میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھوں نے شادی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بارات کی جم کر خاطر داری ہوئی۔ چھوٹی جگہ کے لوگوں کی خوشیاں بھی چھوٹی ہوتی ہیں۔ بارات کی اچھی خاطر داری نے ان کے دلوں میں لڑکی والوں کے لیے عزّت بنالی۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی۔

''پرمود کی تو قسمت کھل گئی۔ اتنے اچھے گھرانے کی لڑکی بیاہ کر لایا ہے۔''

کچھ عورتیں خوش تھیں تو کچھ جل بھن گئی تھیں کیونکہ ان کے گاؤں کا ایک اچھا خاصہ کنوارا ہاتھ سے نکل کر کسی اور کی جھولی میں جا گرا تھا۔

''لڑکی خوبصورت بھی ہے، امیر بھی ہے، پھر تمھارے لڑکے سے بیاہ کیا ہے۔ بہن اچھی طرح سے دیکھ سن کر کیا ہے نا سب تم نے، کہیں کوئی کھوٹ تو نہیں؟''

''کیا کمی ہے میرے بیٹے میں جو اسے ایسی لڑکی نہیں مل سکتی۔ پورے سبحان پور میں

میرے بیٹے جیسا لائق دوسرا ہے کوئی؟'' ماں نے غصّے کو قابو کرتے ہوئے جواب دیا۔

''تم ناراض ہوگئیں بہن۔ ہم تو تمھارے بھلے کی ہی کہہ رہے تھے۔'' ماں خاموش رہی۔

رات ہوتے ہوتے بھیڑ چھٹ گئی۔ گاؤں کی جو عورتیں دلہن کو دیکھنے آئی تھیں۔ کھاپی کر ہنسی مذاق کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔

انجلی سے میری پہلی ملاقات ہماری پہلی رات کو ہی ہوئی۔ سنا تھا کہ پہلی رات بہت رومانی اور رنگین ہوتی ہے۔ اسے مرادوں والی رات بھی کہتے ہیں۔ اس رات کو نہ صرف دو جسموں کا بلکہ دو دلوں کا، دو روحوں کا ملن دھرتی پر ہوتا ہے۔ وہ تقدیر جو عرش پر لکھی گئی تھی، فرش پر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ میں نے صرف اس کی تصویر ہی دیکھی تھی اور اسے لے کر کئی طرح کے خواب سجا رکھے تھے۔ مگر حقیقت میں وہ تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ پہلی نظر میں ہی مجھے اس سے پیار ہوگیا۔ اس پر نظر کیا پڑی میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں آنکھیں جھپکنا بھول گیا۔ میرا منہ بھی حیرت سے کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ میری ایسی حالت دیکھ کر وہ یوں کھلکھلا کر ہنسی کہ میں سردی کے موسم میں اپنی جھینپ مٹانے کے لیے پسینہ پونچھنے لگا۔ اور پھر اپنی حالت پر خود ہی ہنس پڑا۔ ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے میں کب رات رخصت ہوگئی پتا ہی نہ چلا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کٹ گئی۔ نہ آنکھیں تھکیں نہ ہونٹ تھکے اور نہ ہی ہاتھ تھکے۔ پیار کا خمار چڑھا بھی نہ تھا کہ صبح ہوگئی۔ جسم اور روح دونوں ہی تشنہ رہ گئے۔

صبح جب وہ نہا دھو کر تیار ہو رہی تھی تو رات کی طرح اس کا چہرہ کھلا ہوا نہ تھا۔ اس کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر میں گھبرا گیا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمھاری؟''

''ہوں!''

''پھر یہ چاند سا چہرہ مرجھایا ہوا کیوں ہے؟'' میں نے بہت پیار سے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا اتنے گندے گھر میں رہتے ہو تم۔''

اس کا جواب بم کی طرح پھٹا۔ اس طرح کے جواب کی مجھے اُمید نہ تھی۔ اب چہرہ اُترنے کی باری میری تھی۔

''ہمارا گھر چھوٹا ضرور ہے مگر گندا نہیں، صاف ستھرا ہے۔ ہم نے کبھی کسی سے کچھ چھپا نہیں رکھا۔ تمھارے گھر والوں کو سب کچھ معلوم تھا کہ گھر کیسا ہے اور گھر کے لوگ کیسے ہیں۔

اب یہ گھر صرف میرا ہی نہیں تمھارا بھی ہے۔ اسے اپنا سمجھوگی تو اچھا لگنے لگے گا۔'' میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے سمجھانے والے لہجے میں کہا۔

وہ خاموش کچھ سوچتی رہی۔

اس روز کی بات میرے دل میں پھانس کی طرح چبھتی رہی۔ اس کی ضرورتیں زیادہ تھیں اور میری آمدنی کم۔ اس کا رہن سہن اور ہماری سوچ بالکل الگ تھے پھر بھی اس نے خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے کی بہت کوشش کی۔ بات تو تب بگڑی جب ہمارے یہاں پھول سی بچّی نے جنم لیا۔ میں دُنیا بھر کی خوشیاں ان دونوں کو دینا چاہتا تھا اور وہ دُنیا بھر کی چیزیں بچی کے لیے لینا چاہتی تھی۔ بنا سوچے سمجھے کہ کتنا پیسہ خرچ ہوتا ہے اور ہماری آمدنی کتنی ہے؟ اور اگر اس سے ہاتھ روکنے کی بات کرتا تو کہتی:

''گھٹن ہوتی ہے تمھاری روک ٹوک سے مجھے۔''

''اگر تم اپنی خواہشات کی لگام تھوڑی سی کس لو تو تمھیں گھٹن نہیں ہوگی۔''

''میرے ماں باپ نے بھی نہ جانے کس جنم کا بدلا لیا ہے مجھ سے، جو تم جیسے کنگال سے شادی کردی۔'' جب وہ غصّے سے زبان پر قابو نہیں رکھ پاتی تھی تو اناپ شناپ بولنے لگتی تھی۔

''زندگی میں پیسہ ہی سب کچھ ہے کیا؟ یہ بات اہم نہیں کہ میں تمھیں جی جان سے چاہتا ہوں۔ تمھارے ساس سسر تمھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں؟''

''سب سے ضروری پیسہ ہے باقی سب فضول۔''

''یعنی تمھیں پیسہ چاہیے میری محبّت نہیں۔ تمھیں سکون صرف پیسے سے ملے گا میرے پیار سے نہیں۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''انجلی کیا تمھیں صرف پیسہ چاہیے؟ جواب دو میری بات کا۔'' میں نے اونچی آواز میں اس سے پوچھا۔

''ہاں مجھے صرف پیسہ چاہیے۔ سمجھے تم!'' اور وہ پیر پٹکتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اور اس روز کے بعد میں نے بابوجی سے کیا وعدہ بھلا دیا۔ اس کی خوشی کے لیے اپنا ضمیر مارنا شروع کردیا۔ جتنی بار میں کسی بے گناہ کو پھانستا، رشوت لیتا، اتنی ہی بار میرا ضمیر تھوڑا تھوڑا مرتا۔ پھر دھیرے دھیرے مجھے ان باتوں کی عادت پڑگئی۔ پہلے ایسے کام کرتے ہوئے میرا

دل دھڑکتا تھا مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ مجھے ان باتوں کا تجربہ بھی ہو گیا اور خوف بھی کوسوں میل دُور بھاگ گیا۔ اب میں پکّا پولیس والا بن گیا تھا۔ ضمیر کی آواز اَن سنی کرنے کے لیے میں نے شراب کا سہارا لیا۔ مجھے ڈر تھا کہ انجلی کہیں ناراض نہ ہو جائے مگر پیسے کی چمک میں اسے یہ عیب نظر نہیں آیا۔

دھیرے دھیرے میری زندگی کا نقشہ بدل گیا۔ بڑا نیا گھر لے لیا۔ انجلی نے دل کھول کر اس کی سجاوٹ پر پیسہ خرچ کیا۔ اس گھر میں دُنیا بھر کا سامان نظر آتا تھا۔ انجلی کا لباس اور زیوروں کا انتخاب دیکھتے ہی بنتا تھا۔ پہلے دفتر میں میرے دوست مجھے الگ سا سمجھتے تھے مگر اب وہ بھی ہر بات میں مجھے اپنے ساتھ شامل کرتے۔ دفتر میں افسر خوش تھے اور گھر پر انجلی خوش تھی۔ یہ بات اور ہے کہ کسی کیس کو سلجھانے کے لیے مجھے بے شک گنہگار کو چھوڑ کر کسی بے گناہ اور لاچار کو ہی پھانسنا پڑتا۔ میرے افسر میری ترقی کی سوچ رہے تھے اور میں جی جان سے انھیں خوش کرنے میں لگا تھا۔ اب تو جاگتی آنکھوں سے بھی میں کامیابی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ نہ جانے کن بے گناہوں کی آہ وفغاں نے میری قسمت کے چمکتے ستاروں کو گرہن لگا دیا۔

بیس دسمبر کی منحوس رات کو میں اور انسپکٹر یادو دورے پر نکلے۔

کئی غریب لوگ سردی سے نجات پانے کے لیے آگ جلا کر اس کے آس پاس جُھنڈ بنا کر سمٹے سکڑے بیٹھے تھے۔ سردی پورے شباب پر تھی اور کہرے کی وجہ سے صاف صاف دِکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ سڑک پر صرف کبھی کوئی لڑکھڑاتا ہوا شرابی نظر آجاتا تھا۔ جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو ٹھنڈ سے بچنے کے لیے ہم نے بھی شراب کا سہارا لیا۔ اتنی سردی میں گھر کا آرام چھوڑ کر گشت کرنا اتنا آسان تو نہیں۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ ایک عورت سردی اور اندھیرے کی پروا کیے بغیر بھاگی چلی جا رہی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے ایک مردانہ آواز چلاّ رہی تھی۔

''رُک جاؤ رام کلی۔''

مگر وہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''چلیے انسپکٹر صاحب چل کر دیکھتے ہیں کیا ماجرا ہے۔ لگتا ہے اس عورت کو ہماری مدد کی ضرورت ہے۔''

''چلیے تھوڑی سی ڈیوٹی کر لیں۔''

جیپ روانہ کروائی اور ہم نے جا کر اس آدمی کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''کیا بات ہے اتنی رات کو یہ کیا شور مچا رکھا ہے؟''

''صاحب میری بیوی غصّے سے گھر چھوڑ کر بھاگ رہی ہے۔''

''بیوی ہے یا کسی دوسری عورت کو پکڑنے کی کوشش ہے؟''

''نہیں صاحب وہ میری بیوی ہے۔ پکڑیے اسے نہیں تو وہ اپنی جان لے لے گی۔'' وہ گڑگڑایا۔

''ارے تیرے جیسے کئی دیکھے۔ پکڑے گئے تو گڑگڑانے لگے۔''

''صاحب آپ اسی سے پوچھ لو۔''

''چلو۔''

اسے جیپ میں ساتھ بِٹھا کر ہم اس عورت کے پاس پہنچ گئے۔

''اے لڑکی کہاں بھاگ رہی ہے اس وقت؟''

وہ رُک گئی مگر روئے جا رہی تھی۔

''جانتی ہے، کون ہے یہ آدمی؟''

''میں کسی کو نہیں جانتی۔ میرا کوئی نہیں ہے اس دُنیا میں۔''

''غصّہ چھوڑ رام کلی مجھے معاف کر دے۔ آج کے بعد کبھی کچھ نہ کہوں گا۔ تو چل، گھر چل۔''

''نہیں اب میں کبھی تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی پر تیرے ساتھ نہیں رہوں گی۔''

''اتنی رات کو کہاں جاؤ گی؟ گھر جا کر میاں بیوی کا جھگڑا سلجھا لو، تماشا مت کرو۔'' میں نے پورے رعب سے کہا۔

مگر وہ عورت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔

''چلو تم دونوں گاڑی میں بیٹھو، ہمارے ساتھ تھانے چلو۔'' انسپکٹر یادو نے اس عورت کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔

''صاحب دُور سے بات کرو، ہاتھ مت لگاؤ۔'' وہ غصّے سے چلائی۔

''اے لڑکی زبان چلاتی ہے۔ تو جانتی نہیں میں کون ہوں؟''

''ارے صاحب، کوئی بھی ہو تم بات تو تمیز سے کرو۔'' اس کا لہجہ وہی تھا۔
''اوئے تمیز سکھائے گی! مجھے تمیز سکھائے گی۔ میں تجھ سے تمیز سیکھوں گا؟'' انسپکٹر یادو غصے سے آگے بڑھا اور ایک ہاتھ سے اس عورت کے بال پکڑے اور دوسرے سے اسے چانٹا رسید کر دیا۔

رام کلی کا شوہر چپ چاپ یہ نظارہ دیکھ رہا تھا مگر جیسے ہی انسپکٹر یادو نے اس کی بیوی پر ہاتھ اٹھایا وہ اچھل کر اس پر لپکا اور یادو کو دبوچ لیا۔ میاں بیوی دونوں اس پر ٹوٹ پڑے۔ میں ان کو بچانے کی کوشش کرتا رہا مگر جب دونوں نے نہ سنی تو میں نے ریوالور نکال کر ہوائی فائر کر دیا تا کہ وہ ڈر کر یادو کو چھوڑ دیں مگر گولی غلطی سے اس آدمی کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔ ایک دردناک چیخ اور پھر سناٹا۔ رام کلی رونے چلانے لگی اور میرا نشہ ہرن ہو گیا۔
''یہ تو نے کیا غضب کر دیا؟'' یادو جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا۔
''یار میں تو تجھے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔'' حالات کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''میں سنبھالتا ہوں اسے، تُو بھاگ جا۔'' اور میں بنا سوچے سمجھے گھر آ گیا۔
بے چینی دُور کرنے کے لیے پھر سے شراب پی اور آرام سے سو گیا۔
انجلی بھی شالی کو لے کر مائکے گئی ہوئی تھی اس لیے کسی سے کوئی سوال جواب بھی نہ ہوا۔
صبح تقریباً گیارہ بجے کے قریب دروازے پر زور زور سے دستک کی آواز سے میری نیند ٹوٹی۔ میرے ہی ساتھی میری گرفتاری کا وارنٹ لیے کھڑے تھے۔ مجھ پر عورت سے چھیڑ چھاڑ اور پھر اس کے شوہر کے قتل کے سنگین جرم کا آروپ تھا۔
''ہمیں افسوس ہے آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ یہ تو آپ نے پڑھ ہی لیا ہے کہ ہم آپ کو کس جرم کے لیے گرفتار کرنے آئے ہیں؟'' انسپکٹر نے وارنٹ دکھاتے ہوئے کہا۔
میں حیران پریشان بُت بنا کھڑا رہ گیا۔ اس بات کی تو میں نے کبھی توقع بھی نہیں کی تھی۔ پولیس کی وردی اب تک میرے جسم پر تھی۔ رات شراب اور گھبراہٹ کے عالم میں وردی بدل نہ سکا۔ ایک پولیس انسپکٹر ہو کر بھی میں اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔
اس دن جو میں نے وردی اُتاری پھر دوبارہ نہ پہن سکا۔ زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ جس دوست کے لیے یہ سارا جوکھم اٹھایا وہ ہی بدل گیا۔ اس کی غداری مجھے بہت مہنگی پڑی۔ جو ہم

لوگوں کے ساتھ کرتے آئے تھے وہی میرے ساتھ ہو گیا۔ یاروں نے کہانی ہی بدل دی۔ سارا الزام میرے سر لگا دیا اور خود کو صاف بچالیا۔ رام کلی غریب بیوہ نہ جانے ڈر کی وجہ سے یا پھر لالچ کی وجہ سے اپنا بیان بدل گئی۔ مقدمہ چلا سب کچھ میرے خلاف تھا اور پھر اپنا گناہ قبول کرنے کے سوا میرے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہ تھا۔ نوکری، عزّت، اعتبار، رتبہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ مجھے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ یاروں پر آنچ بھی نہ آ سکی اور اس کی ترقی میں جو میں دیوار بنا کھڑا تھا وہ بھی اس کے غلط بیان سے خود بخود ڈھ گئی۔

میری گرفتاری کی خبر سن کر انجلی اور اس کے والد بھاگے چلے آئے تھے۔ انھوں نے پیسہ پانی کی طرح خرچ کر دیا۔ وہ انصاف بھی خریدنا چاہتے تھے مگر میرے اعترافِ گناہ کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ انجلی نے بہت منّتیں کیں کہ میں اپنا بیان بدل ڈالوں مگر میں اپنے ضمیر پر جمی کائی کو دھوڈالنا چاہتا تھا۔ انجلی کی چھٹ پٹاہٹ بھی میرے ارادے کو ڈگمگا نہ سکی۔

''میں نے بہت بے گناہوں پر ظلم کیے ہیں۔ ان کی آہیں، ان کے آنسو، ان کی مجبوری، ان کی بیکسی کا احساس مجھے اب ہو رہا ہے۔ میں بھٹک گیا تھا یہ بہت تیز اور اندھا دھند بھاگنے کی سزا ہے جو میں منہ کے بل گر پڑا۔ تم مجھے پرایشچت کرنے سے مت روکو۔''

''تم یہ نہیں سوچ رہے کہ ہمارا کیا ہو گا؟ میں کیا کروں گی شاملی جب بڑی ہو جائے گی تو اسے کیا جواب دوں گی؟''

''اب تک تمھارے بارے میں ہی تو سوچتا رہا۔ تمھیں پیسہ چاہیے تھا وہ مل گیا۔ تمھارے پاس اتنا پیسہ ہے کہ تم زندگی آرام سے گزار سکتی ہو۔ بس اتنی مہربانی کرنا کہ شاملی کو ایسی تربیت مت دینا جس سے وہ کسی اچھے بھلے انسان کو حیوان بننے پر مجبور کر دے۔''

وہ سر جُھکائے خاموش میرے طنز سنتی رہی۔

دو روز بعد جب انجلی پھر مجھے جیل میں ملنے آئی تو میں نے اسے آئندہ وہاں آنے سے منع کر دیا۔

''تم واپس اپنے مائکے چلی جاؤ۔ یہاں اکیلی کیا کرو گی؟ میری طرف سے تمھیں اجازت ہے کہ تم نئے سرے سے زندگی شروع کر لو۔ مجھے بھول جاؤ۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟''

''میں بہت سوچ سمجھ کر یہ سب کہہ رہا ہوں۔ پہاڑ سی زندگی تنہا نہیں کاٹ سکو گی تم۔

میری زندگی کے سنہرے برس تو اب اس چار دیواری میں کٹنے والے ہیں۔ بس اتنا ضرور کرنا کہ شاملی کو یہ مت بتانا کہ اس کا باپ بُرا انسان تھا۔''

''اصلی گنہگار تو میں ہوں۔ میں نے ہی ایک نیک انسان کو بدی کا راستہ دِکھایا، سزا تو مجھے ملنی چاہیے۔'' انجلی سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

''یہ جو گھر میں نے تم کو بنا کر دیا ہے اسے بیچ دینا اور اس کا سارا پیسہ شاملی کے نام جمع کرا دینا۔ اس کی پڑھائی کے کام آئے گا۔''

''تم ہماری فکر چھوڑ دو بس اپنا خیال رکھو۔''

''ملنے کا وقت ختم ہوا۔'' حوالدار نے آ کر کہا۔

اس کی آنسوؤں سے لبریز خاموش نگاہیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے چوم لیے اور شاید وہ ہی اس کے ہونٹوں کا آخری لمس تھا جسے میں مدّتوں محسوس کرتا رہا۔

میں نے اسے یہ جان بوجھ کر نہیں بتایا تھا کہ مجھے کس جیل میں بھیجا جا رہا ہے۔ جانے سے پہلے میں اس کے نام مختصر خط ضرور چھوڑ آیا تھا:

''انجلی!

میں تم سے بہت دُور جا رہا ہوں۔ زندگی بہت قیمتی ہے اسے یوں ہی مت گنوا دینا۔ مجھے بھول جانا اور تمھیں اُن حسین پلوں کی قسم دوبارہ مجھے ملنے کی یا مجھ سے رابطہ رکھنے کی کوشش بھی مت کرنا۔

شاملی کو ایک اچھا انسان بنانا بس یہ ہی میری تم سے آخری التجا ہے۔

تمھارا پرمود''

اس روز کے بعد میں نے کبھی اس کی صورت نہیں دیکھی۔ بوڑھے ماں باپ کی کمر تو اسی روز ٹوٹ گئی تھی جب انھیں گرفتاری کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ ان بوڑھی ہڈّیوں میں اتنی طاقت کہاں تھی کہ مجھے ملنے جیل آ جاتے اور پھر یہاں کی جیل میں تبادلہ ہو جانے کے بعد تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ ان سے نظریں ملانے کی تاب مجھ میں بھی نہیں تھی۔ ان کے خط باقاعدگی سے آتے رہے۔ ماں نے تو سزا کی خبر سن کر بستر ہی پکڑ لیا اور کچھ روز بعد اس دُکھ سے نجات پا لی۔ ابا شہر کا مکان بیچ کر مائکے چلی گئی۔ اس کے بعد مجھے ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔

بابو جی کے آخری خط میں شاملی کا ذکر ضرور تھا۔انھوں نے لکھا تھا:

''آج اگر تمھاری ماں زندہ ہوتی تو شاملی سے مل کر اسے سینے سے لگا کر اپنا ہر غم بھول جاتی۔ میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گیا جب وہ 'دادا دادا' کہہ کر میرے گلے لگ گئی۔ایسا لگا جیسے برسوں کی پیاسی دھرتی پر اچانک برسات ہوگئی ہو۔ بہت ہی پیاری بچی ہے۔اس سے ملنے کے بعد میں نے تو اس کی ماں کو معاف کردیا۔ ہو سکے تو تم بھی اسے معاف کر دینا۔''

بابو جی کو کیا بتاتا کہ میں نے جو گناہ کیے وہ اس کی محبّت میں، اسے خوش کرنے کے لیے کیے۔ میں چاہ کر بھی اس سے نفرت نہ کر سکا، نہ ہی اسے کبھی بھلا سکا۔ آج بھی میرے ذہن اور دل میں وہ پل زندہ ہیں جو ہم نے ساتھ گزارے۔ معلوم نہیں وہ کبھی میرے بارے میں سوچتی بھی ہوگی یا اپنی زندگی سنوارنے میں مجھے بھول گئی ہوگی۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ اُس نے شادی کر لی کہ نہیں، کسی سے سُنا ضرور تھا کہ اس کے والدین اسے دوبارہ بیاہ کر و دیش بھیجنا چاہتے تھے۔خیر! میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ مجھے اس چار دیواری میں ایک نئی زندگی، نیا مقصد مل گیا۔لوگوں کے کام آ سکا۔ان کی الجھنیں سلجھانے میں یہ قید کی معیاد کاٹنا آسان ہو گیا۔ پھر ضمیر پر پڑا گناہوں کا بوجھ بھی ہٹ گیا اور دل کو جو سکون ملا اس کا کیا بیان کروں۔تم لوگوں سے جو پیار اور عزّت ملی ہے وہ جینے کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔''

''بھگوان کرے آپ کی آنے والی زندگی بہت اچھی گزرے۔ شاملی بیٹا آپ کو مل جائے بابو صاحب!'' رام سنگھ میری روداد سن کر اُداس ہو گیا تھا۔

آخر آزادی کا دن آ گیا۔۱۴ر اگست کی رات میں سو نہیں پایا۔صبح کا انتظار، باہر کی دُنیا، پھر مستقبل کی فکر۔کبھی جیل کے ساتھیوں سے بچھڑنے کا غم تو کبھی شاملی سے ملنے کی چاہ اور خوشی۔انجلی کو دیکھنے کی ٹیس۔ان سب جذبات نے چین کی سانس نہ لینے دی۔

پوری جیل میں خوشی کا ماحول تھا آج جشنِ آزادی کے سلسلے میں جیل میں کئی پروگرام رکھے ہوئے تھے۔

''بابو صاحب! آپ تیار ہیں۔ چلیے جیلر صاحب نے بلایا ہے۔'' اس بات کو سننے کے لیے کان ترس گئے تھے۔

''آیئے پرمود بابو! آج تو بہت خوشی کا دن ہے۔''

''جی ہاں یہ تو ہے آج تیرہ سال بعد رہائی مل رہی ہے۔''

''میں مبارک اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ کو کوئی لینے آیا ہے۔''

''مجھے؟ کون؟''

''بابا میں شاملی!'' ایک کم سن سی لڑکی کمرے میں یہ کہتے ہوئے داخل ہوئی اور آ کر میرے گلے سے لپٹ گئی۔

اگر اس کی شکل انجلی سے نہ ملتی ہوتی تو میں اسے پہچان بھی نہیں پاتا۔ اس خوشی کے لیے تو میں تیار ہی نہ تھا۔ غم اور خوشی کے آنسوؤں سے میں نے اپنی بیٹی کا چہرہ بھر دیا۔ جیسے ہی وہ میرے سینے سے لگی مجھے بابا کی پیاسی دھرتی والی بات یاد آ گئی۔ اتنے سالوں سے جو سیلاب رُکا ہوا تھا وہ جم کر برسا۔

''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں پر ہوں اور آج رہا ہو رہا ہوں۔''

''ماں نے بتایا تھا۔ دادا سے معلوم ہوا تھا کہ آپ یہاں ہو اور ماں نے پتہ لگالیا کہ آپ کب آزاد ہو رہے ہیں۔''

''کیسی ہے تمھاری ماں؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''سجان پور چل کر دیکھ لینا۔''

''سجان پور! وہ وہاں کیا کر رہی ہے؟''

''ماں نے دادا کے نام سے ایک اسکول کھولا ہے وہیں پڑھاتی ہیں۔''

''اور تم؟''

''میں تو چنڈی گڑھ میں انجینئرنگ کر رہی ہوں۔''

''تمھاری ماں نے دوبارہ شادی نہیں کی؟''

''بابا! وہ سزا کاٹ رہی ہیں اُن گناہوں کی جو انھوں نے آپ سے کروائے۔ سہاگن ہوتے ہوئے بھی انھوں نے بیوہ جیسی زندگی گزاری ہے۔ آپ انھیں معاف کر دیں گے نا بابا؟'' میں نے ایک بار پھر اسے سینے سے لگالیا۔ اور ہم سجان پور نئی زندگی کی شروعات کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔

○○

سراب

جیسے ہی وہ شام کو گھر سے مندر جانے کے لیے باہر نکلی، مَیں پھُرتی سے بستر سے اُٹھا اور جا کر دروازے کے پاس پڑی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں ایک ٹک سامنے سُدھا کو تلاش کر رہی تھیں۔ سات بجنے میں ابھی وقت تھا، میں نے کھڑکی کے پردے ٹھیک کیے، پھر بستر کی چادر تھوڑی سی سنواری۔ کمرے کی روشنی مدھم کر دی تھی تا کہ باہر سے اندر کا نظارہ صاف نہ دکھ سکے اور پھر کرسی پر جا بیٹھا۔ آج سُدھا کے گھر کا فاصلہ بھی بہت زیادہ لگ رہا تھا حالانکہ ہم دونوں کے گھر آمنے سامنے تھے اور بیچ میں صرف چھوٹی سی ایک سڑک تھی۔ میری بیوی نے میرے گھر کو، جو کہ ایک کمرے کا تھا، بہت سلیقے سے سجا رکھا تھا۔ دروازے کے سامنے دو کُرسیاں، اُس کے بائیں طرف بستر اور بیچ میں ایک چھوٹا سا ٹیبل، باہر برآمدے میں چِق لگا کر ایک کونے میں رسوئی۔ اس چھوٹے سے کمرے میں میری پوری دُنیا سمٹ گئی تھی۔ ہم صرف دو لوگ ہی تو تھے۔ سال بھر میں میری بیوی شہر کے طور طریقے سیکھ لے گی، اس کی مجھے اُمید نہ تھی۔ گاؤں میں پیدا ہوئی، وہیں پلی بڑھی، پہلی بار میرے ساتھ شہر آئی اور بہت جلد شہر کے رنگ میں رنگ گئی۔ گاؤں میں تو کبھی باہر کا کام اس نے خود نہیں کیا تھا۔ گھر سے باہر کبھی اکیلی نہیں نکلی تھی مگر یہاں آ کر ایک سال میں اُس کی کایا پلٹ گئی۔ گاؤں میں جو گھونگھٹ گز بھر لمبا ہوا کرتا تھا، وہ سرکتا سرکتا سر سے نیچے اُتر گیا۔ باہر کے کام بھی وہ اکیلی ہی کر لیتی۔ اب اُسے میرے ساتھ کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یہاں آ کر تو اُس کی طبیعت میں بھی زمین آسمان کا فرق پڑ گیا تھا۔

شادی کے سات سال بعد بھی جب ہمارے یہاں اولاد نہ ہو سکی تو گھر والوں نے اور گاؤں کی عورتوں نے جینا دُشوار کر دیا، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے طعنے دیا کرتیں۔ مایا تو ادھ مری سی ہو گئی تھی۔ کوئی مندر، مسجد، پیر فقیر، پنڈت نہیں چھوڑا۔ میں اُس کی رونی شکل دیکھ کر اُکتا گیا

تھا۔ یہ تو بھلا ہو بھولا ناتھ کا، جس نے مجھے شہر کی فیکٹری میں کام دلوا دیا۔ سب سے اچھا کام تو اس نے مجھے یہ کمرہ دلوا کر کیا۔ یہ جگہ ہم دونوں کو بہت راس آئی۔

بھولا ٹھیک ہی کہتا تھا کہ شہر کی زندگی بہت رنگین ہوتی ہے۔ پہلے ہی روز سُدھا مجھے بھا گئی۔ سامنے والے گھر میں پنڈت شام لال اپنی بوڑھی اندھی ماں کی دیکھ بھال کے لیے اپنی دُور دراز کی بیوہ رشتے دار کو گاؤں سے لے آئے تھے۔ وہ چالیس سال کے قریب ہوں گے۔ درمیانہ قد، رنگ گندمی اور عام سی شکل وصورت والے پنڈت جی کی معلوم نہیں شادی ہوئی کہ نہیں، بچّے ہوئے کہ نہیں، بس اُس گھر میں صرف تین لوگ رہتے تھے۔

پنڈت شام لال کو مایا کافی ماننے لگی تھی۔ اُن کے گھر کافی آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اسی بہانے کبھی کبھی سُدھا ہمارے گھر آیا کرے گی اور پھر اُس کی صحبت میں وہ کافی خوش رہنے لگی تھی۔ گھر میں بھی ماحول ٹھیک ہو گیا تھا۔ اُسے امید تھی کہ پنڈت شام لال کے ٹونے ٹوٹکوں سے وہ جلد ہی ماں بن جائے گی۔ حالانکہ میں نے ان سب باتوں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور اسی لیے نہ میں کبھی اُس سے پوچھتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور نہ ہی وہ مجھے بتاتی تھی۔ وہ خوش تھی، گھر کا ماحول ٹھیک تھا، بس میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

میں تو بس سُدھا کا سفید لباس دیکھ کر دُکھی ہو جاتا۔ کیسے بے رنگ زندگی کاٹتی ہوگی۔ ابھی اُس کی عمر ہی کیا ہے۔ تقریباً پچیس کے قریب ہوگی۔ ابھی اُس نے دُنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔ سارا دن گھر کا کام کرنا اور بوڑھی موسی کی دیکھ بھال، اس کے علاوہ اُس کی زندگی میں کچھ نہ تھا۔ کبھی گھر کی صفائی کرتے ہوئے یا کپڑے سکھانے کے لیے جب وہ باہر آتی، میری نظریں ہمیشہ اُسے ہی تلاش کرتیں۔ میری آنکھوں میں اس کے لیے جو جذبات تھے، وہ اُس نے شاید پڑھ لیے تھے۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی وہ گھبرا کر، شرما کر جلدی جلدی کام نپٹا کر اندر چلی جاتی۔ میرے گھر بھی وہ اُس وقت آتی، جب میں فیکٹری گیا ہوتا۔

مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ سارا دن میں اُسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ مجھے مایا میں بھی اُسی کی صورت نظر آنے لگی۔ مایا میرے لیے کھانا پروستی تو مجھے لگتا سُدھا کھانا پروس رہی ہے۔ اُسے ہاتھ لگاتا تو مجھے لگتا میں مایا کو نہیں سُدھا کو چھُو رہا ہوں۔ میرے پورے ہوش وحواس پر بُری طرح اس نے اپنا قبضہ کر لیا۔ اگر وہ مجھے اکیلے میں نہ ملی تو میرے دماغ کی بوجھل نسیں

پھٹ جائیں گی۔ میں اس سے ملاقات کا موقع تلاش کرنے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ جو آگ ادھر لگی ہے، وہی آگ اُدھر بھی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے پر کہہ نہیں پا رہی۔ آج میرا شک یقین میں بدل گیا، جب صبح فیکٹری جاتے وقت گلی کے نکڑ پر اُس نے ہاتھ دے کر میری سائیکل روک لی۔ پھر اُس نے چور نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔''

''کہو۔''

''یہاں نہیں۔''

''پھر کہاں؟ شام کو پارک میں؟''

''نہیں، آج منگلوار ہے۔ جب مایا شام کو مندر جائے گی تب۔''

''ٹھیک ہے۔ اُس کے جاتے ہی آ جانا۔ میں انتظار کروں گا۔''

میری بات سنے بغیر ہی وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتی آگے نکل گئی۔ سردی کے موسم میں بھی میری پیشانی پسینے سے بھر گئی۔ میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ خوشی اور گھبراہٹ کا عالم تھا۔ اُچھل اُچھل کر دِل سینے سے باہر آنا چاہتا تھا۔

سارا دن بہت مشکل سے گزرا۔ کمبخت دن ڈھلنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا گھڑی کی سوئیاں رُک گئی ہیں۔ خدا خدا کر کے سات بج گئے۔ جیسے جیسے اُس کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا، میرے دل کی دھڑکنیں بڑھ رہی تھیں۔ میری آنکھیں اُس کے راستے میں بچھی ہوئی تھیں، کان اُس کے قدموں کی آہٹ سننے کو بے چین تھے۔

اُس کے دستک دینے سے پہلے ہی میں نے دروازہ کھول دیا اور اُسے بستر پر بیٹھ جانے کو کہا۔ میں بھی اُس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ دل نے چاہا، اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لوں مگر اتنی بے قراری بھی ٹھیک نہیں۔ جلد بازی میں کام خراب بھی ہو سکتا ہے۔

''پنڈت جی گھر پر ہی تھے؟''

''مندر گئے ہیں۔ تبھی تو آئی ہوں۔ اگر اُنھیں معلوم ہو گیا تو غضب ہو جائے گا۔'' اُس کی آواز میں لغزش تھی۔

''تم ڈرو مت، اُنھیں کچھ پتہ نہیں چلے گا۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''میں کئی روز سے آپ کو ملنا چاہتی تھی۔ آپ سے بات کرنے کا مگر موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔''

''میں سمجھ گیا تھا کہ تم کوئی بات کرنا چاہتی ہو۔ میں بھی موقع کی تلاش میں ہی تھا۔''
میں اُس کے اور قریب کھسک گیا۔
''تم چائے لوگی؟''
''نہیں نہیں میں زیادہ دیر نہیں رُکوں گی۔ مایا کے آنے سے پہلے میں جانا چاہتی ہوں۔''
''تم اطمینان سے بیٹھو وہ اتنی جلدی نہیں آئے گی۔''
''نہیں، مجھے جلدی جانا ہے۔'' اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
''ابھی تو آئی ہو......''
''میں تو بس اتنا کہنے آئی تھی کہ تم بھلے اور سیدھے سادے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جیوتش کی آڑ میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے، یہ تم نہیں جانتے، ہو سکے تو اپنا گھر ٹوٹنے سے بچالو۔ ورنہ تم اپنی بیوی کو کھو دو گے اور مَیں اُن کا سہارا۔''
اتنا کہہ کر وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

OO

فاصلے

اُسے گھر کے ماحول میں کسی طرح کی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔ سبھی کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے۔ آج کے دن بھی گھر میں چولہا نہیں بجھا۔ میتا نے رانا کی موت کی خبر سن کر اس طرح ان سُنی کر دی جیسے اخبار میں کسی خبر پر ایک پل کے لیے نظر رُکے اور پھر دوسری خبروں میں مصروف ہو جائے۔

ویسے تو اس گھر میں میتا کے علاوہ اس کا اور رانا کا اکلوتا بیٹا شمشیر اور اس کی نئی نویلی دُلہن بھی رہتے تھے۔ دو پُرانے خادم بھی تھے جنھوں نے میتا کے والد کے نمک کا حق ادا کرنے کے لیے ہی جنم لیا تھا۔ شمشیر بھی دلیر سنگھ کو ماں کی طرح بڑے کاکا کہہ کر بلاتا تھا اور بڑے کاکا کا بھانجا رنبیر تو شمشیر کے ساتھ کھیل کر ہی جوان ہوا تھا۔ جب شمشیر کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہہ پاتا تو رنبیر ہی ایک ایسا شخص ہوتا جو اُس کا درد بانٹ لیتا۔ اس کی رگوں میں راجپوتی خون ضرور بہہ رہا تھا مگر اُن جیسی اکڑ نہ تھی۔ رنبیر ایک خادم ہوتے ہوئے اُس کا دوست بھی تھا، ہمراز بھی اور ہمدرد بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حویلی کے اس کونے میں جہاں کوئی آتا جاتا نہ تھا، آج پھر رنبیر کے ساتھ اپنا دُکھ بانٹ رہا تھا۔ دُلہن کو آئے ابھی چند روز ہی ہوئے تھے، اس لیے وہ گھر کی باتیں اس سے کھل کر نہیں کر سکتا تھا جو اب تک ان سب باتوں سے بالکل ہی بے خبر تھی۔

''آپ کو حوصلہ رکھنا چاہیے سرکار۔''

''کیسے حوصلہ رکھوں میرے یار۔ وہ میرا باپ تھا۔ ساری عمر میں اُس کی محبت سے محروم رہا مگر پھر بھی دل میں ایک تسلّی تھی کہ میرے سر پر ایک سایہ دار پیڑ ہے۔ بے شک میں اُس کی ٹھنڈی چھانو سے ساری عمر محروم رہا۔ لیکن اب تو سر پر وہ سایہ بھی نہ رہا۔'' شمشیر کی آنکھیں نم تھیں۔

''سرکار! یہ آنسو آپ کو زیب نہیں دیتے۔ آپ ایک راجپوت مرد ہیں۔ آپ اس طرح

دل چھوٹا مت کیجیے۔ اگر بڑی سرکار نے آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تو ان کو بڑی تکلیف ہوگی۔''

''اسی لیے تو تیرے ساتھ یہاں اس کونے میں بیٹھا ہوں۔ ایک تو ہی تو ایسا دوست ہے جس سے کبھی کچھ چھپایا نہیں جس کے سامنے مجھے رونے میں بھی شرم نہیں آتی۔''

اُن دونوں میں عجیب سا رشتہ تھا۔ شمشیر کے لاکھ کہنے کے باوجود وہ ہمیشہ اُسے ''سرکار'' کہتا تھا اور ماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ رنبیر کو ہمیشہ ''یار'' کہتا تھا۔

کسی طرح بہلا کر رنبیر اسے حویلی کے اندر لے آیا اور وہ ماں کے سامنے آتے ہی ایسے مسکرا اُٹھا جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ اپنے درد کی اس نے ماں کو بھنک تک نہ پڑنے دی۔ وہ اپنے باپ کی موت کا ماتم دل ہی دل میں منا رہا تھا۔ وہ باپ جس کی شفقت سے وہ ساری زندگی محروم رہا۔ جس کی زندگی اُس کے لیے باعثِ شرم تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر بھی وہ ماں کا چہرہ اس طرح پڑھ رہا تھا۔ جیسے جاننے کی کوشش کر رہا ہو کہ اُس کی ماں کو شوہر کے انتقال کی خبر سن کر تکلیف ہوئی ہے یا نہیں۔ مگر اس بار بھی وہ ماں کا چہرہ پڑھنے میں ناکام رہا۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد معمول کی طرح میتا اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئی۔

بستر پر لیٹتے ہی زندگی کا ایک ایک ورق اُس کے سامنے کھلنے لگا۔ وہ اتنی سنگ دل تو کبھی نہ تھی کہ ایک آدمی کی موت پر افسوس بھی نہ کر سکتی۔ وہ تو کسی جانور کو بھی تکلیف میں دیکھتی تو بے ساختہ، آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ پھر رانا تو اس کا شوہر ہوا کرتا تھا۔ اُس کے بیٹے کا باپ۔ یہ الگ بات تھی کہ اُن کو جدا ہوئے پچیس برس گزر چکے تھے۔ کیا سارا قصور رانا کا ہی تھا؟ اُس کا کوئی دوش نہیں تھا۔ ساری عمر اُس نے رانا سے نفرت میں گزار دی۔ کچھ پل تو ایسے تھے جب رانا نے اسے چاہا تھا، اس سے پیار کیا تھا، اُس کی تمنا کی تھی۔ کیا اُن لمحوں کی خاطر بھی اُس کی آنکھیں دو اشک نہیں بہا سکتیں؟ شاید وہ شروع سے ہی سنگ دل تھی۔

چار بھائیوں کی اکلوتی بہن اور وہ بھی سب سے چھوٹی۔ کچھ تو اُن کے لاڈ پیار نے اور کچھ دُنیا نے یہ کہہ کہہ کر کہ کتنی خوبصورت ہے۔ چاندی جیسی دمکتی ہے۔ ہاتھ لگائے میلی ہوتی ہے،اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ گھر میں دولت بے شمار تھی۔ نوکر چاکر آگے پیچھے گھومتے تھے۔ اس لیے کبھی خود پانی کا گلاس بھی نہیں پیا۔ ماں کئی بار ڈانٹتی تو کبھی اُس کے والد یا کوئی نہ کوئی بڑا بھائی آ ٹپکتا:

''کیوں بیکار میں غصہ کرتی ہو۔ایسے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو صرف راج کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔''

''مگر لڑکی ذات ہے۔کھانا بنانا تو آنا چاہیے۔کیا ہم کھانا بنانا نہیں جانتے۔جب تم لوگ فرمائش کرتے ہو کہ آج آپ کے ہاتھوں کا ہی کھانا کھائیں گے تو کیا ہم کھانا نہیں بناتے۔ عورت کو کھانا بنانا تو آنا ہی چاہیے۔''

''ماں! آپ اتنا اچھا کھانا بناتی ہیں تو ہمیں بنانے کی کیا ضرورت ہے؟'' میتا مچل کر بولتی۔

''ساری عمر یہیں تو نہیں بیٹھی رہے گی۔سسرال بھی تو جائے گی۔وہ کیا کہیں گے کہ لڑکی کو کھانا بنانا بھی نہیں آتا؟''

''تو کیا ہم اپنی بیٹی کو ایسے گھر بھیجیں گے جہاں کھانا اسے بنانا پڑے۔ابھی اتنے بھی بُرے دن نہیں آئے ہمارے۔جا بِیٹا تو جا یہاں سے نہیں تو تیری ماں تجھے دیکھ کر چپ بیٹھنے والی نہیں۔''

والد کا اشارہ پاتے ہی وہ وہاں سے بھاگ جاتی اور ماں سر پکڑ کر بیٹھ جاتی۔

جوان ہوتے ہوتے کئی اچھے گھروں سے رشتے آ گئے۔کبھی کوئی ایک رشتہ ایک بھائی کو ناپسند ہوتا تو کبھی دوسرے کو اور جب رانا کا رشتہ اس کے لیے آیا تو سب کو پسند تھا مگر میتا کو نہیں۔اسے اعتراض تھا:

''لڑکے کا رنگ گندمی ہے۔میرے خوابوں کا شہزادہ بہت خوبصورت ہے ماں۔''

''پاگل لڑکی! خوابوں کی دُنیا سے باہر نکل، اب تو سیانی ہوگئی ہے۔لڑکوں کی صورت نہیں، اُن کی سیرت دیکھی جاتی ہے۔لڑکا پڑھا لکھا، اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور دیکھنے میں بھی بُرا نہیں۔مجھے اُمید ہے تجھے بہت خوش رکھے گا۔''

ماں نے سمجھا بجھا کر اُسے شادی کے لیے راضی کر لیا۔

بھائیوں کی لاڈلی گھر سے رُخصت کیا ہوئی، گھر میں سناٹا چھا گیا۔اس کے جاتے ہی گھر ایک ویران گلشن کی طرح ہو گیا۔جیسے پھولوں سے مہک گم ہو جاتی ہے، ہواؤں میں سنگیت ختم ہو جاتا ہے۔دوسری طرف سسرال میں آتے ہی جیسے رونق آ گئی ہو۔اس گھر میں رانا کے علاوہ اس کی ماں اور ایک چھوٹا بھائی تھا جو بھابھی کے آنے سے ایسے خوش تھا جیسے اُسے ساری دُنیا مل

گئی ہو۔ گھر میں بہن تو تھی نہیں، بس وہ بھابھی میں بہن کا روپ بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک تو لاڈ پیار اور ناز نخروں سے پلی بڑھی، دوسرے خوبصورتی کا گمان، چڑھتی جوانی، پھر بھائیوں کا بار بار اُس کے سسرال میں آنا، اُسے نئے گھر میں رچنے بسنے میں بہت دقت پیش آئی، کچھ ہی روز میں سسرال میں یہ بات مشہور ہوگئی:

''دُلہن کے اندر تو غرور کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اپنی خوبصورتی پر بہت ناز ہے اُسے۔''

ناز کا عالم تو یہ تھا کہ شوہر بھی اگر روشنی میں ہاتھ لگالیتا تو وہ ناک منہ سکیڑ لیتی۔ میتا کی نگاہ میں اپنے لیے حقارت اس سے چھپی نہ تھی۔ وہ دِل ہی دِل میں جل بھن کر رہ جاتا۔ کبھی تو اس کے جی میں آتا کہ اُس کی سفید چمڑی کو اُدھیڑ دے۔ کاش بیوی ایسی ملتی جو دل کی بھی خوبصورت ہوتی، جو اُس سے پیار کرتی، اُس کی عزّت کرتی مگر وہ تو ظاہری حسن پر ہی مرمٹا۔ اُس کی مخالفت کے باوجود میتا کے بھائی بہن پر دولت لٹا رہے تھے جس کی اس گھر میں بھی کوئی کمی نہ تھی۔ ہر وقت بیوی کی اکڑی ہوئی گردن دیکھتے دیکھتے وہ تنگ آچکا تھا۔ ایک روز ہنسی ہنسی میں اُس نے کہہ ہی دیا۔

''جناب! ہوسکے تو تھوڑی سی گردن ڈھیلی چھوڑ دو۔''

''کیوں؟'' وہ تنک کر بولی۔

''اتنی اکڑا کر رکھوگی تو چٹ سے ٹوٹ جائے گی۔'' اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''مجھے اس طرح کا بے ہودہ مذاق بالکل پسند نہیں۔ آئندہ مجھ سے ایسا مذاق کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اپنی بیوی سے مذاق نہ کروں تو کس سے کروں؟''

''کسی سے بھی کرو مگر مجھ سے نہیں۔'' اُس نے تیکھے لہجے میں کہا اور اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ماں کا دُکھ یہ تھا کہ اُس کا بیٹا شادی سے خوش نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ہر ممکن کوشش کرتی کہ بیٹے کو سمجھا بجھا دے تاکہ وہ خوش رہ سکے۔

''ابھی ناسمجھ ہے۔ عمر ہی کیا ہے اس کی، دھیرے دھیرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''مگر کب ماں؟''

''دیکھ بیٹا! جب شروع شروع میں بیاہ کر آئی تھی تو دیور کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔ مگر

اب دونوں میں بہت دوستی ہوگئی ہے، تو نے دیکھا نہیں راجن بھابھی کے آجانے سے کتنا خوش ہے۔ دھیرے دھیرے سب رشتے سمجھنے لگے گی۔''

ماں کی باتیں اُس کے بے چین دل کو رَاحت دیتیں۔ پھر جب اُس کے پاؤں بھاری ہوئے تو سسرال والوں نے اُسے سرآنکھوں پر بٹھالیا۔ ماں بننے کی خوشی نے اُس پتھر کے مجسمہ کو موم بنادیا۔ اب پاؤں زمین پر ٹکنے لگے تھے۔ وہ خود کو اس خاندان کا ایک اٹوٹ حصّہ سمجھنے لگی تھی۔ جس چیز کو رانا ترس رہا تھا، وہ اب اُسے بیوی کی نظروں میں صاف نظر آنے لگی۔ جب اُس نے اُن آنکھوں میں اپنے لیے محبت اور عزّت دیکھی تو وہ زندگی کی سب محرومیوں کو بھول گیا۔

مگر ایک بار پھر بھائیوں کی محبت، شوہر کی محبت پر حاوی ہوگئی۔ بھائیوں کو جب معلوم ہوا کہ وہ ماما بننے والے ہیں تو بہن کے سسرال اُسے لانے کے لیے جا پہنچے۔ میتا کی ساس اور رانا نے اُنھیں بہت سمجھایا۔

''ابھی تو بہت وقت پڑا ہے، بعد میں بھیج دیں گے۔''

مگر بھائی تو کچھ سننے کے لیے تیّار ہی نہیں تھے۔ ہار کر فیصلہ میتا پر چھوڑ دیا گیا۔ کبھی وہ اپنے شوہر کا منہ دیکھتی تو کبھی بھائیوں کا — اور جیت بھائیوں کی ہوئی۔ میتا جانے کو تیّار ہوئی تو رانا غصّے سے باہر نکل گیا۔ بے وجہ وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور سوچتا رہا کہ شاید اُس کی ناراضگی کا کچھ اثر بیوی کے دل پر ہوا ہو اور اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ دل میں ہلکی سی امید لیے وہ گھر لوٹا تو اُس کی تمناؤں پر ڈھیروں پانی پھر گیا۔ میتا اس کی پروا کیے بغیر جا چکی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی ہوگی کہ شوہر پیچھے پیچھے دُم ہلاتا بھاگا چلا آئے گا مگر ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ رانا کو سسرال سے بہت بلاوے آئے مگر اُس نے کبھی ایک تو کبھی دوسرا بہانہ بنادیا اور ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ جس روز اُسے معلوم ہُوا کہ میتا نے بیٹے کو جنم دیا ہے۔ اُس روز وہ سارا غصّہ، ساری تلخی بھول گیا۔ خوشی کے جذبے نے نفرت اور غصّے کو دُور کردیا۔ انا دھری کی دھری رہ گئی اور یہ خبر سنتے ہی وہ سسرال بھاگا چلا گیا۔

''آخر آنا ہی پڑا نا آپ کو ہمارے پاس؟''

کمرے میں داخل ہوتے ہی بیوی کے یہ جملے تیر کی طرح اُس کے دل میں پیوست ہوگئے۔ وہ سر سے پاؤں تک جل بھن گیا۔

"ہمارے یہاں؟ شاید تم بھول رہی ہو کہ شادی کے بعد لڑکی کا سسرال اُس کا گھر ہوتا ہے۔ مائیکے میں تو اُس کی حیثیت مہمان سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور مہمان صرف دو دن اچھے لگتے ہیں۔ ویسے بھی میں اپنی اولاد سے ملنے آیا ہوں۔"

اُس نے ننھی سی جان کو بڑھ کر گود میں اٹھالیا۔ اپنے خون میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ بیٹے کو گود میں اٹھاتے ہی اُس کا روم روم کھل اُٹھا اور ساری تلخی ایک دم غائب ہوگئی۔ خوشی سے چہرہ دمکنے لگا۔ اس خوشی کے نشے میں بیوی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اُس نے جیسے ہی جھک کر بیتا کا ماتھا چومنا چاہا تو اُس نے غصّے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس سے زیادہ ذلّت برداشت کرنے کی اس میں قوت نہ تھی۔ منّے کو ایک بار پھر پیار سے چوما اور جیب میں سے تحفہ، جو وہ اپنی بیوی کے لیے لایا تھا، بچّے کے ساتھ بستر پر رکھا اور تیز قدموں سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ آج کئی مہینوں بعد داماد گھر آیا تھا۔ اس لیے نوکروں کو چائے کے خاص انتظام کی ہدایت دے کر جب ساس لوٹ رہی تھی تو رانا باہر نکل رہے تھے۔

"داماد جی کیا ہوا؟ سنیے تو! جا رہے ہیں کیا؟"

اُس نے ایک پل کے لیے رُک کر ساس کو دیکھا اور بنا کچھ کہے حویلی سے نکل گئے۔ داماد کی آنکھوں میں درد، نفرت اور غصّے کا ملا جلا تاثر اُس سے چھپا نہ رہ سکا۔ اپنے بچّوں کی نادانیوں سے وہ پہلے ہی پریشان تھی۔ سمجھ گئی کہ بات بگڑ گئی ہے۔

"کیا ہوا بیتا؟ داماد جی اس طرح اچانک غصّے سے بنا کچھ کہے سنے کیوں چلے گیا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تجھے نہیں معلوم تو کسے معلوم ہے۔ آئے تو وہ خوشی خوشی تھے۔ پھر کیا بات ہوئی۔ کس بات پر خفا ہوگئے؟" ماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"غصّہ کیا انھیں ہی آتا ہے۔ دوسروں کو نہیں آ سکتا۔ مجھے کتنے مہینے ہوگئے مائیکے آئے۔ کتنی بار بلاوا بھیجا مگر ایک بار بھی ملنے نہیں آئے اور نہ کوئی خبر لی۔ بچّے کی خبر سنی تو بھاگے چلے آئے۔ کیا مجھے اپنے شوہر پر غصّہ ہونے کا حق نہیں ہے؟"

"ایک تو تم اُن کی مرضی کے خلاف آئیں۔ پھر اپنے حق کی بات کرتی ہو۔ غصّہ گلہ بعد میں بھی تو کیا جا سکتا تھا۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دو ماں۔"

''کیسے چھوڑ دوں۔ اگر تو سمجھ دار ہوتی تو چھوڑ دیتی تیرے بھائیوں نے اور تیرے باپ کے لاڈ پیار نے تجھے بگاڑ رکھا ہے۔ اب کی بار ایک نہ سنوں گی کسی کی، تجھے داماد جی سے معافی مانگنی ہوگی۔''

''میں ایسا کچھ بھی نہیں کروں گی۔''

''اگر تو ضدی ہے تو میں بھی تیری ماں ہوں۔ دیکھتی ہوں کس طرح نہیں مانگتی۔ نادان لڑکی! تو تو اپنا گھر برباد کرنے پر تلی ہے۔ نہ جانے کب عقل آئے گی؟''

غصے سے پیر پٹکتی ہوئی ماں بھی کمرے سے باہر چلی گئی۔ میتا نے ماں کا ایسا روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ ماں کے جاتے ہی وہ بچے کو سینے سے لگا کر دل کھول کر روئی۔

ماں کی ضد کے آگے سب کو جھکنا پڑا۔ ادھر منا سوا مہینے کا ہوا، اُدھر ماں نے بیٹی کو سسرال روانہ کر دیا۔ بچّے کو پا کر دادی اور باپ تو خوش تھے مگر بیوی کی طرف رانا کے تیور بدلے بدلے سے تھے۔ ماں کی نصیحت کے مطابق میتا نے اپنا رویّہ بدل لیا مگر اُس نے محسوس کیا کہ اب رانا کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اُسے شاید بیوی کے بِنا رہنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ شوہر کی بے رُخی سے وہ تلملا اُٹھی، اس کی انا کو گہری چوٹ جو لگی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ مینکا بن کر شوہر کی تپسیا بھنگ کرے گی، مگر اس طرح کی بے عزّتی ہرگز برداشت نہیں کرے گی۔

اُس روز وہ صبح سے ہی سجنے سنورنے کی تیاری میں لگ گئی۔ پہلے بدن پر چندن کا لیپ کیا۔ پھر گلاب جل میں غسل کیا، زلفوں کو طریقے سے سنوارا، ہاتھ پاؤں مہندی سے سجائے۔ گلابی رنگ سے ملتی چوڑیاں نکال کر خادمہ نے دیں جو صبح سے ہی اُس کی مدد میں لگی ہوئی تھی۔ سج دھج کر وہ خود آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لے رہی تھی اور دل میں سوچ رہی تھی کہ آج اُس نے سجنے سنورنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آج رانا جی بچ کر کہاں جائیں گے؟ تبھی دوسری نوکرانی بھاگی بھاگی آئی اور اُس کے کانوں میں کچھ کہا جسے سنتے ہی اُس کا گلابی چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ جلدی سے ننگے پاؤں ہی اُس کے ساتھ ہولی۔ حویلی کے پچھواڑے نوکروں کی ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کر کے وہ خود جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی۔ میتا کے دروازہ کھٹکھٹانے کے کوئی پانچ منٹ بعد ایک سانولی سی، دُبلی پتلی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی۔ میتا نے اُسے دوسری طرف دھکیلا اور اندر داخل ہوگئی۔ مخمل کے بستر پر سونے والے کو آرام سے

پرانے بوسیدہ بستر پر بیٹھے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ میتا کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، مگر رانا کی آنکھوں میں کوئی شرمندگی نہ تھی۔ اُس کی آنکھیں ایسے مسکرا رہی تھیں جیسے اُس کا مذاق اُڑا رہی ہوں۔ شوہر کی زہریلی مسکراہٹ اُسے اندر تک چیرتی چلی گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے میتا نے اپنی ساری چوڑیاں توڑ دیں۔ ماتھے سے خود اپنے ہاتھوں سے سیندور پونچھ ڈالا۔ بندیا مٹا ڈالی۔ بنا کچھ کہے وہاں سے پلٹی اور حویلی سے منّے کو گود میں لیے مائیکے آ گئی۔

اُس دن کے بعد سے اُس نے بیوہ کا لباس پہننا شروع کر دیا۔ اس کھیل میں ایسا موڑ بھی آئے گا، اس کی اُمّید رانا کو نہ تھی۔ یہ سارا ڈرامہ تو اُس نے بیوی کو جلانے، اُسے سبق سکھانے کے لیے رچا تھا۔ ایک دو بار اس نے اپنی صفائی دینا چاہی مگر میتا نے کچھ بھی سننے سے انکار کر دیا۔ جو منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا، اُس کے بعد کہنے سننے کو رہ ہی کیا گیا تھا۔ میتا کے چاروں بھائی تو اُسے جان سے ہی مار ڈالتے مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے بیٹے کے باپ کے قاتل اُسی کے بھائی ہوں۔ لہٰذا بھائیوں نے جان تو بخش دی مگر شہر میں اُسے اتنا رُسوا کیا کہ اُس کا جینا حرام ہو گیا۔ بیوی سے ملی ذلّت، بیٹے کی جدائی، اس پر یہ رُسوائی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت بڑا گنہگار بن گیا۔ ماں بیٹے کا گھر دوبارہ بسانے میں ناکام رہی۔ کوئی بھی شریف آدمی اپنی بیٹی دینا نہیں چاہتا تھا۔ بیٹے کے غم نے ایک روز اُس کی جان لے لی اور رانا کی باقی زندگی بدنام گلیوں میں گزر گئی۔

میتا نے ساری عمر اپنے بیٹے کو اُس کے باپ کے سائے سے دُور رکھا۔ ایک ہی شہر میں ہونے کی وجہ سے کوئی نہ کوئی خبر اُس تک پہنچ جاتی۔ جیسے جیسے بھائیوں کی شادیاں ہوتی گئیں۔ بھابھیاں بھائیوں کو لے کر الگ ہوتی گئیں۔ ماں باپ کب تک ساتھ نبھاتے۔ بس زندگی نے ایک ہی سہارا اُس کے نام کا رکھ چھوڑا تھا۔ شمشیر نے اپنی ماں کو تڑپتے روتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی ماں کا درد محسوس کرتا تھا مگر سچّائی کیا ہے۔ اُس نے اگر کبھی جاننا بھی چاہا تو ماں نے ہمیشہ ٹال دیا۔ وہ باپ کے پیار کو ترستا رہا مگر ماں کو کبھی خبر نہ ہونے دی۔ آج جب اُس تک یہ خبر پہنچی کہ ایک لمبی بیماری کے بعد اُس کے والد کا انتقال ہو گیا ہے تو بھی وہ ماں کے سامنے دو آنسو نہ بہا سکا۔

آج پہلی بار میتا کی آنکھوں سے نفرت کا پردہ ہٹا تو اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔ اُس کا شوہر تو اُسے بے حد پیار کرتا تھا۔ اُسی نے اُسے دُھتکارا تھا، اُسی نے مجبور کیا تھا کہ وہ اُس

سے دُور ہو جائے۔ اُس کے گمان نے کبھی شوہر کو اپنا نہیں سمجھنے دیا۔ وہ ایک ناکام بیوی ہی نہیں ایک ناکام ماں بھی ہے۔ ساری عمر ایک باپ اپنے بچے کو ترستا رہا۔ ایک بیٹا یہ جان نہیں پایا کہ باپ کی محبت کیا ہوتی ہے۔ جن بھائیوں کے دَم پر وہ اکڑتی تھی، آج وہ اپنی اپنی گھر گرہستی میں اتنے مصروف تھے کہ اُن کے پاس یہ جاننے کے لیے وقت ہی نہیں تھا کہ اُسے کوئی تکلیف تو نہیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ تڑپ اُٹھی۔ اُسے نہیں معلوم کب آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے شروع ہوئے تھے۔ یہ آنسو شرمندگی کے تھے یا تڑپ کے یا اُس دکھ، اُس چبھن کے جسے اُس نے دِل کے کسی کونے میں دبا رکھا تھا۔ اور آج نہ جانے وہ کیسے باہر آ گئے تھے۔ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ فیصلہ کن انداز میں کمرے سے باہر آئی اور بیٹے کو بلا بھیجا۔ ''ماں مجھے بلایا آپ نے؟ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟''

''میں ٹھیک ہوں۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے، تو اپنے بابا کو آخری بار اس گھر میں لے آ۔''

''کیا؟'' وہ حیرت سے ماں کو تکے جا رہا تھا۔

''ہاں بیٹا، میں چاہتی ہوں اُن کی رُخصتی اپنے گھر سے ہو اور ساری رسمیں اُن کا بیٹا پوری کرے۔ جلدی جا بیٹا، کہیں یہ موقع بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔'' پھر سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس گھر میں موت ہوئی ہے۔ لاوارث لاش کو بیوی، کھویا ہوا بیٹا اور اُس کا گھر مل گیا تھا۔

OO

اعتراف

''باپ کے سامنے زبان چلاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ بالشت بھر کی چھوکری گز بھر کی زبان۔'' سمن نے زوردار چانٹا رسید کرتے ہوئے کہا۔ بیٹی کی بے ادبی پر وہ غصّے سے لرز رہی تھی۔

ندھی کے چہرے پر نہ شرم تھی نہ افسوس۔ اس کی آنکھوں سے انگارے ایسے برس رہے تھے جیسے ماں کو جلا کر راکھ کر دے گی۔

''اب رہنے دو سُمن، اِسے تو کوئی شرم لحاظ رہا ہی نہیں۔'' میں نے تھکے ہوئے لہجے میں ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔

''رہنے کیسے دوں؟ ابھی چار روز ہوئے نہیں کالج میں داخلہ لیے اور وہاں سے بھاگ کر سارا دن اس بدمعاش کے ساتھ گھوم کر واپس آئی ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ اسے اپنے کیے پر شرمندگی بھی نہیں۔''

''میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس کی وجہ سے مجھے شرمسار ہونا پڑے۔'' ندھی نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''کسی غیر لڑکے کے ساتھ سارا سارا دن گھومتی ہو اور اوپر سے ماں باپ کے ساتھ بے شرمی سے زبان لڑاتی ہو۔ آنکھوں کا پانی ڈھل چکا ہے کیا؟''

''کیا زمانہ آ گیا ہے، ہم تو آج بھی اپنے ماں باپ سے اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔''

''آپ لوگ مجبور کرتے ہیں مجھے زبان چلانے کے لیے، مجھے صرف آزادی چاہیے۔ میں اپنی مرضی سے اپنی زندگی جینا چاہتی ہوں۔ تھک گئی ہوں آپ لوگوں کی روک ٹوک سے، کبھی یہ نہ کرو، کبھی وہ نہ کرو۔ یہ ٹھیک نہیں، یہ غلط ہے۔ آپ مجھے میری مرضی سے جینے دیں۔ میں زبان چلانا بند کر دوں گی۔''

''تم چاہتی ہو تم جس طرف چاہو منہ اُٹھا کر چلتی رہو اور ہم اپنی آنکھیں بند کر لیں، اپنے لب سی لیں۔ تمھیں کچھ نہ کہیں۔ ہم تمھارے ماں باپ ہیں کوئی دشمن تو نہیں۔'' میں نے اپنے لہجے میں نرمی لاتے ہوئے کہا۔

''میں صاف صاف کہہ چکی ہوں، میں امت سے پیار کرتی ہوں اور اس کے بغیر رہ نہیں سکتی۔''

''ٹھیک ہے اگر تمھارا یہی فیصلہ ہے تو میں اس کے والدین سے تمھاری شادی کی بات کرتا ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔ ابھی ہم پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہیں۔''

''تو پھر پہلے تعلیم مکمل کر لو پھر ملنا۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم بِنا ملے نہیں رہ سکتے۔''

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟'' میرے صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ میں نے چلّاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہمارے ملنے پر کوئی روک ٹوک نہ ہو اور ہم جب چاہیں جس وقت چاہیں ایک دوسرے سے مل سکیں، بس اتنی سی تو بات ہے۔'' اس نے بھی اونچی آواز میں جواب دیا۔

''کل کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ہم دُنیا کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ابھی تمھاری کچّی عمر ہے تم زندگی کے بارے میں جانتی ہی کتنا ہو؟'' سُمن پھر بھپر کر بولی۔

''ہمیں اچھے بھلے کی پہچان ہے ماں! ہم اپنی زندگی ٹھیک سے جی سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنے کمرے میں جاؤ اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔'' بات کو وہیں ختم کرتے ہوئے میں وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

ندھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور سُمن سر پکڑ کر وہیں بیٹھی رہی۔

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں یہ دن بھی دیکھنا پڑے گا۔ اپنے تو اپنے غیر بھی مجھ سے بات کرنے سے پہلے دس بار سوچتے تھے۔ اگر میں اونچی آواز میں بولوں تو میری بہنیں میری بیوی اور یہاں تک کہ میری ماں بھی ڈر جاتی ہیں۔ میری بہنیں اتنے بڑے بڑے بچوں کی مائیں بن گئی ہیں مگر آج بھی میرے غصہ کو سمجھتی ہیں اور یہ میری اکلوتی بیٹی، جسے میں نے دُنیا میں سب سے زیادہ پیار کیا، اسی نے جوانی میں قدم رکھتے ہی میری کمر توڑ دی۔ میں نے ہر طرح

سے سمجھا کر دیکھ لیا، مگر میں ناکام رہا۔ پیار سے سمجھانا چاہا مگر جب بات حد سے بڑھ گئی تو ہاتھ بھی اُٹھانا پڑا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جس طرح وہ میرے سامنے بے حیائی سے زبان چلاتی ہے، افسوس ہوتا ہے۔ نہ جانے اس کی پرورش میں کس جگہ بھول ہوگئی۔ ہم نے تو اسے ایسے سنسکار نہیں دِیے تھے پھر یہ ماحول کا اثر ہے یا بڑے اسکول میں پڑھانے کا نتیجہ۔ بچے میں خود اعتمادی ہو اس لیے اپنی حیثیت سے بڑھ کر شہر کے بڑے اسکول میں تعلیم دلوائی مگر حد سے بڑھ کر خود اعتمادی شاید مناسب نہیں۔ وہ اپنے آپ کو اتنا سمجھ دار سمجھنے لگی ہے کہ اسے لگتا ہے کہ دُنیا پاگل ہوگئی ہے، صرف وہ سمجھ دار ہے۔ اسے چھوٹے بڑے کا لحاظ بھی نہیں رہا۔ اگر آج ندھی اٹھارہ سال کی ہوتی تو میں زبردستی اس کی شادی کر دیتا، مگر ایسی اولاد کے ساتھ تو زبردستی بھی نہیں کی جاسکتی۔ اگر وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی تو میں آج ہی اسے گھر سے نکال دیتا، مگر وہ اس قابل نہیں کہ باہر کی بے رحم دُنیا کا مقابلہ کر سکے۔ اپنا اچھا بُرا سمجھ سکے۔ عشق کے بھوت نے اس کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہے۔ جوانی تو سب پر آتی ہے اور زندگی میں کبھی نہ کبھی تقریباً عشق بھی سبھی کرتے ہیں، مگر اس طرح نہیں کہ والدین کی شرم ہی نہ رہے۔ شرم تو لڑکی کا زیور ہے میں نے بھی تین تین بہنوں کو جوان ہوتے دیکھا ہے مگر اپنی ہی اولاد سے میں ہار گیا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے ان کی ساری ذمہ داری مجھ پر آن پڑی، جب بابو جی کا بے وقت انتقال ہوا۔ اس وقت گیتا کی عمر بیس سال تھی اور میں اٹھارہ کا۔ نمرتا اور نینا ہم دونوں سے چھوٹی تھیں۔ گیتا کی سگائی بابو جی نے خود کی تھی اور شادی بھی طے ہوچکی تھی۔ بابو جی کے گزر جانے کے بعد گیتا شادی ملتوی کر دینا چاہتی تھی بہت روئی گڑگڑائی مگر ماں نے ایک نہ سنی اور طے شدہ تاریخ پر شادی کر دی۔

دکانوں کا کرایہ آتا تھا اس لیے مالی طور پر کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ گھر کا خرچ آرام سے چلتا تھا مگر بابو جی کی کمی سب سے زیادہ اس وقت کھلتی تھی جب دوسری پریشانیاں گھیر لیتی تھیں۔ ماں اکیلی پڑ جاتی۔ گھر میں واحد مرد ہونے کی وجہ سے اور بھائی بہنوں میں اس وقت سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے ساری ذمّہ داری مجھ پر آن پڑی۔ مجھ پر عورتوں کی ذمہ داری کا بوجھ اتنا تھا کہ جوانی کا رنگ مجھ پر چڑھ ہی نہ سکا۔ دوسرے لڑکوں کی طرح نہ میں کہیں آنکھیں لڑا سکا اور نہ باپ کے مال پر عیش کر سکا۔ میری جوانی تو جوان ہوتی ہوئی بہنوں کو سنبھالنے میں گزر گئی۔ آج نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ اتنی بے چینی اور بے خوابی کا عالم تو تب بھی نہ تھا

جب نمرتا نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔

میں کالج سے شام کو لوٹا تو نمرتا سہیلیوں کے ساتھ باہر کھڑی تھی۔

''تم لوگ یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''بھیّا، آشا کو چھوڑنے آئی تھی'' اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''اگر باتیں رہ گئی ہوں تو اندر بیٹھ کر کرو۔ آئندہ میں تمھیں اس طرح باہر کھڑے نہ دیکھوں۔'' میں غصّے سے اندر داخل ہوتے ہی ماں پر برس پڑا۔

''کئی روز سے دیکھ رہا ہوں نمرتا ہمیشہ گھر سے باہر ہوتی ہے اور تم ہو کہ آرام سے بے فکر ہو کر بیٹھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''ہوا تو کچھ بھی نہیں بس یہ چند لڑکیاں اِدھر ہلّڑ مچاتی رہتی ہیں اور اُدھر وہ لڑکوں کا جھنڈ انھیں تکتا رہتا ہے۔''

''لے آ گئی تیری بہن خود ہی بات کر لے۔'' ماں نے اپنا پلّا چھڑاتے ہوئے کہا۔

''آج کل ستیش کے ساتھ کیا چل رہا ہے؟'' غصّے سے میں نے پوچھا اور وہ ہڑبڑا گئی۔

''کچھ...... کچھ نہیں بھیّا۔'' اس کی آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا اور زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

''مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے کہ چپکے چپکے تم دونوں میں خطوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔ کب سے چل رہا ہے یہ سب؟''

وہ خاموش کھڑی رہی۔

''اگر میں نے کبھی اسے اس گھر کے چکّر لگاتے دیکھ لیا یا مجھے معلوم ہوا کہ خط کا لین دین ہو رہا ہے تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ جاؤ پڑھائی پر دھیان دو۔''

وہ چپ چاپ سر پر پاؤں رکھے اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔

اس دن کے بعد میں نے کبھی اسے گھر سے باہر کھڑے نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی بات سُنی۔ اس بات سے بھی میں ناواقف نہ تھا کہ ستیش کئی روز سے گھر کے چکّر کاٹ رہا تھا، جب وہ نمرتا سے ملنے میں ناکام رہا تو گھر تک آ پہنچا۔

''بھائی صاحب مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''کہو؟''

''میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ عزت دار لوگوں کا خاندان ہے۔ ہمارے یہاں ایسے فیصلے بزرگ کرتے ہیں۔ لڑکا لڑکی نہیں۔'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''میں بھی ایک عزت دار گھر سے تعلق رکھتا ہو۔ تعلیم یافتہ ہوں، اچھا کما لیتا ہوں اور ہم ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں۔ والدین بچپن میں چل بسے اس لیے یہ کام مجھے خود کرنا پڑ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہم اس کے بارے میں سوچیں گے اور تمھیں اطلاع کر دیں گے۔'' یہ بات کہتے ہوئے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور مجبوراً اسے بھی اُٹھنا پڑا۔

کچھ روز پہلے ہی نمرتا کے لیے ایک رشتہ آیا تھا جس کے بارے میں ابھی گھر میں بات بھی نہ ہوئی تھی اور ستیش کے جاتے ہی میں نے ماں سے اس کے رشتے کی بات کر دی۔

''لڑکا تو یہ بھی بُرا نہیں ہے۔'' ماں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''لیکن ماں یہ بالکل اکیلا ہے۔ اس کے گھر میں کوئی بھی نہیں۔ جس گھر میں لڑکی جائے اس کا خاندان پریوار تو ہونا چاہیے۔''

''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔'' ماں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''تو پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''جیسا تم مناسب سمجھو وہ کرلو۔'' ماں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا۔

آج سوچتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کس بات پر ستیش کو ناپسند کیا تھا۔ دُنیا میں تنہا ہونا کوئی گناہ تو نہیں۔ اس کی منّتیں، نمرتا کا رونا، نینا کا سفارش کرنا مجھے میرے فیصلہ سے نہ ہلا سکا۔ میں نے ان کی ایک نہ سنی اور نمرتا کا رشتہ دوسری جگہ پکّا کر دیا۔ لڑکا خاندانی رئیس اور بھرے پورے خاندان سے تھا۔ نمرتا نے چپ چاپ شادی کر لی حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس کا دل رو رہا ہے مگر اس نے اس بات کی شکایت نہ کی اور نہ کبھی اپنا غم مجھ پر ظاہر ہونے دیا۔ گھر والوں کے فیصلے کے آگے اس نے سر خم کر دیا۔ آج کے حالات دیکھتے ہوئے میرا جی ایسی بہن کے آگے سر جھکانے کو کرتا ہے۔

''میں تو کہتی ہوں، آپ لڑکے کے ماں باپ سے بات کر کے دیکھو۔'' سمن نے پریشان حالت میں کمرے میں گھستے ہوئے کہا۔

''سب بات کر چکے، اب کیا بات کریں۔ وہ بھی تو ہماری طرح مجبور اور لاچار ہیں۔ ان دونوں نے تو کسی کی بھی بات کو نہ ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ نہ تو ان کی ابھی عمر ہے، نہ تعلیم مکمل کی اور نہ روزی روٹی کا کوئی ذریعہ۔ پھر شادی کیسے کردیں۔''

''پھر اس مصیبت کا کیا حل ہے؟''

''ہمارا تو سمجھانا فرض ہے باقی اس کی قسمت۔'' میں نے سب کچھ قسمت پر چھوڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ میں نے کیسی اولاد پیدا کی۔ ہمارے ہی سامنے کہہ رہی ہے کہ کھلے عام لڑکے سے ملے گی۔ شادی بھی نہیں کرے گی۔'' سمن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اس میں تمھارا یا میرا کوئی قصور نہیں۔ زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے۔ مغربی تہذیب کا اثر نوجوانوں پر کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔ جو والدین اس ماحول میں ڈھل گئے ہیں وہی سکھی ہیں اور ہمارے جیسے، جو اپنی تہذیب نہیں بھول پائے، وہ پریشان ہو رہے ہیں۔''

دو تین روز گھر میں تناؤ بھرا ماحول رہا۔ اس موضوع پر کسی نے کوئی بات نہ کی۔ مگر بات ٹالنے سے ٹل تو نہیں سکتی۔ اگر بلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لے تو کیا کبوتر کی جان بچ جائے گی؟ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ میں جس مسئلے کو ٹال رہا تھا وہ میرے سامنے پھر آ کھڑا ہوا۔ رات کے دس بج گئے مگر ندھی کا کوئی پتہ نہیں۔ وہ کالج سے لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ سُمن پاگلوں کی طرح اندر باہر چکّر لگا رہی تھی اور میں چپ چاپ بیٹھا اس کی اس حالت کو دیکھ رہا تھا، میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کی سب سہیلیوں کو فون کر کے پوچھ لیا تھا وہ کسی کے ساتھ نہ تھی۔ جدھر اسے تلاش کرنا چاہیے تھا وہاں بھی نہ تھی۔ میں تھک ہار کر اس کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ زمانہ خراب ہے۔ آج کل ہر دوسرے دن اخباروں میں عجیب عجیب طرح کی خبریں چھپی ہوتی ہیں۔ اسے سوچ سوچ کر پریشان تھا۔ گھر سے باہر سمن اکیلے جاتے ہوئے گھبراتی ہے۔ بھگوان نہ کرے کسی بدمعاش کے ہاتھ لگ گئی تو؟ میں یہ سوچتے ہی لرز اُٹھا۔ کیا مجھے پولیس کے پاس جانا چاہیے۔ نہیں نہیں لڑکی کا معاملہ ہے، پولیس کو تو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ میں ان ہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ باہر موٹر سائیکل رُکی۔ کھڑکی سے دیکھا تو ندھی اسی لڑکے کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ میں جل کر رہ گیا۔

''یہ وقت ہے گھر آنے کا؟'' میں نے غصّے سے پوچھا۔

''شکر کرو آ تو گئی۔'' وہ لاپرواہی سے بولی۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟'' میں اس کے جواب سے دنگ رہ گیا۔

''اگر آپ لوگوں نے اسی طرح روک ٹوک کی تو ہو سکتا ہے میں گھر چھوڑ کر چلی جاؤں۔''

''تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟'' سمن نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے میں کیا کہہ رہی ہوں۔ آپ جتنی جلدی ہو اس کا مطلب سمجھ لیں تو بہتر ہے۔'' اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہی رہ گئے۔

اس رات، ہم دونوں سو نہیں سکے۔

''اگر ندھی گھر چھوڑ کر چلی گئی تو ہم دُنیا کو کیا منہ دِکھائیں گے؟''

''دُنیا کی چھوڑو، تم یہ سوچو اگر اس نے گھر سے باہر قدم رکھ دیا تو وہ کرے گی کیا۔ نہ تو اس کے پاس تعلیم کا خزانہ ہے نہ کسی طرح کی کوئی لیاقت۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ دُنیا کتنی بے رحم ہے۔''

''پھر اسے کیسے سمجھایا جائے۔ وہ تو کسی کی بھی بات سننے کو تیار نہیں۔''

''مجھے لگتا ہے کوئی اسے گمراہ کر رہا ہے۔''

''کہیں کسی نے اس پر جادو ٹونا تو نہیں کر دیا ہے، جو ہماری بات نہیں مانتی۔ ہمیں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگی ہے۔''

''کچھ روز ایسا کرتے ہیں کہ اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ وہ کیا کرتی ہے؟ کدھر جاتی ہے؟ کب آتی ہے۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ اگر دیر سے بھی آتی ہے تو شکر ہے واپس تو آ جاتی ہے۔ ہے تو گھر میں ہی، ہماری آنکھوں کے سامنے۔ ہم تو بس یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اس کو گمراہ ہونے سے بچا لیں۔ بڑے بڑے بادشاہ اولاد سے ہار گئے تو میں کیا چیز ہوں۔''

اس رات دل میں یہ خیال آیا کہ جا کر اس کا گلا دبا دوں مگر اولاد ہے شاید اسی لیے یہ بھی نہ کر سکا۔ ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا اچھا۔ کتنی منّتوں کے بعد اِسے پایا تھا، اس کی خاطر میں نے اپنی صحت کی پروا نہیں کی اور پیسے کمانے کی دوڑ میں شامل ہو گیا۔ دن رات ایک کر دِیے۔ ہمارے لاڈ پیار نے اسے ضدی بنا دیا۔ اتنی ڈھیٹ تو نینا بھی نہ تھی حالانکہ وہ نمرتا کا مقابلہ کبھی

نہیں کرسکتی مگر پھر بھی وہ آج تک مجھ سے بے پناہ پیار کرتی ہے۔ بھائی اور باپ دونوں کی شفقت اسے مجھ سے حاصل ہوئی۔ آج بھی وہ مجھے اسی طرح پیار کرتی ہے، میری عزّت کرتی ہے جیسے دیوندر کے ملنے سے پہلے کیا کرتی تھی۔

دیوندر کھاتے پیتے گھر کا تعلیم یافتہ خوبصورت نوجوان تھا۔ اپنے والد کے ساتھ کاروبار کرتا تھا مگر تھا ایک نمبر کا شرابی اور جواری۔ جب مجھے نینا اور دیوندر کی ملاقاتوں کے بارے میں معلوم ہوا تو میں نے اسے بہت پیار سے سمجھایا مگر اس کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا اسے میری ہر بات بُری لگ رہی تھی۔

''شراب پینا کوئی بُری بات تو نہیں۔ یہ تو آج کل کا فیشن ہے۔''

''ہر چیز ایک حد تک ٹھیک لگتی ہے۔ شراب بھی اور جوا بھی۔ عادت کوئی بھی ہو وہ بُری ہے۔ حد سے زیادہ شراب اور جوا تجھے دُکھ کے سوا کچھ نہیں دیں گے۔''

''اگر وہ شراب اور جوا چھوڑ دے تو؟''

''پھر ہم تمھاری شادی دھوم دھام سے کر دیں گے۔''

نینا خوشی سے چلاّتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی اور میں اس کی اس حرکت پر مسکرائے بِنا نہ رہ سکا۔

چھ مہینے گزر گئے، ایک روز نینا میرے پاس آئی۔

''بھیا! دیوندر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنے والدین کو راضی کرلیا ہے اور جیسا آپ چاہتے ہیں، اس نے شراب اور جُوا چھوڑ دیا ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے یہ تو۔ کتنے روز ہوئے شراب چھوڑے؟ کہیں کل شام ہی تو نہیں چھوڑی؟'' میں نے شرارت سے پوچھا۔

''بھیّا! دو مہینے ہوگئے اس نے شراب کو چھوا تک نہیں۔''

''ٹھیک ہے، جب چاہو انھیں بلالو۔ اب تو خوش ہے نا۔''

''میرے اچھے بھیّا۔'' میرا ہاتھ چومتے ہوئے اس نے کہا اور بھاگ گئی۔

''پاگل لڑکی'' میں ہنس دیا۔

میں تو کبھی کلب وغیرہ جانا پسند نہیں کرتا مگر اس روز شیام بھائی مجھے کسی خاص آدمی سے ملوانے کے لیے کلب لے گئے۔

''یہ میرے خاص دوست، پران ورما ہیں جو امریکہ میں رہتے ہیں۔ ان کو اپنے بیٹے کے لیے ایک اچھی سی لڑکی کی تلاش ہے، اور میں تمھاری چھوٹی بہن کے لیے تمھیں ان سے ملوانے لایا ہوں۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ مگر مجھے اپنی ماں سے بات کرنی پڑے گی۔ ویسے بھی ایک جگہ اس کی بات چل رہی ہے اور رشتہ بھی پکّا ہی سمجھو۔''

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، مگر جس طرح سے شیام بھائی نے آپ کی بہن کی تعریف کی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ ہیرا ہمارے گھر آئے۔'' ورما صاحب نے رسمی طور پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا۔

بات وہیں ختم ہوگئی اور پھر چند باتیں اِدھر اُدھر کی ہوئیں اور میں نے جانے کے لیے اجازت لے لی۔

میں نے لان سے باہر قدم رکھا کہ میری نظر سامنے والے ٹیبل پر پڑی۔ دیوندر اپنے دوستوں کے ساتھ ہاتھ میں تاش کے پتے اور ٹیبل پر سامنے جام رکھ کر جوا کھیلنے میں مصروف تھا، دل تو چاہا کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑلوں مگر میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ گھر آتے ہی میں نے نینا کو بلالیا۔

''تم تو کہتی تھیں کہ دیوندر نے شراب چھوڑ دی ہے۔''

''ہاں بھیا۔''

''جھوٹ بولتا ہے وہ، اور پاگل ہو تم جو اس کی باتوں میں آگئیں۔'' میں نے چلاّ کر کہا۔

وہ سہم گئی اور رونے لگی۔

''نینا وہ تم سے جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے آج اسے اپنی آنکھوں سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے دیکھا ہے۔ وہ تمھیں بے وقوف بنا رہا ہے۔'' میں نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتا، اس نے میرے سر کی قسم کھائی ہے۔''

میری باتوں پر اسے یقین ہی نہ تھا۔

''ٹھیک ہے تو کل اس سے پوچھنا کہ وہ کلب میں کیا کر رہا تھا۔''

میں وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

اگلے روز مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس میں جھوٹ بولنے کا عیب بھی ہے۔ نینا اسے

میرے سامنے لے کر آئی اور وہ صاف مکر گیا۔ اس نے تو اس بات سے بھی انکار کر دیا کہ وہ کلب گیا تھا۔ ''میری آنکھوں کو دھوکہ ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ صاف بچ گیا۔ نینا نے اعتبار کر لیا مگر میں نے نہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھا تھا۔ کیسے مان لیتا اس کی بات۔ پھر میں نے اپنی تسلّی کے لیے کلب کا رجسٹر چیک کروایا۔ میں صحیح تھا اور وہ غلط۔ میں نے شادی سے صاف منع کر دیا۔ نینا بہت روئی، دیوندر گھر تک آ پہنچا اور مجھے دھمکی بھی دی۔

''اگر آپ شادی کے لیے راضی نہیں ہوں گے تو کوئی بات نہیں۔ ہم دو روز بعد شادی کر رہے ہیں۔ آپ کو آشیرواد دینا ہو تو آ جانا۔ نینا تم تیار رہنا، میں صبح دس بجے لینے آؤں گا۔ یاد رہے پرسوں دس بجے صبح۔''

میں نے نینا کو بہت سمجھانا چاہا لیکن اس نے تو بات سننے سے ہی انکار کر دیا۔

''آپ تو دشمن ہیں پیار کے اور ہم بہنوں کے۔ آپ کے سینے میں تو دل ہے ہی نہیں۔ پیار ہوتا کیا ہے، معلوم ہے آپ کو؟ وہ نمرتا ہی تھی جس نے اپنا پیار آپ کے کہنے پر قربان کر دیا۔ میں دیوندر کے بنا نہیں رہ سکتی۔ اسی سے شادی کروں گی آپ کو چاہے پسند ہو یا نہیں۔''

''ٹھیک ہے ماں! اگر اس کی قسمت میں زندگی بھر رونا ہی لکھا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔'' میں بھی اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ماں نے بھی بہت سمجھایا مگر نینا ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ پھر وہ امتحان کی گھڑی آ ہی گئی۔ یہ دو راتیں ہم نے آنکھوں میں گزاریں۔ اس روز میں دفتر جانے سے پہلے نینا کے کمرے میں گیا تو وہ شاید جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

''تو تم نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔''

وہ خاموش رہی۔

''ٹھیک ہے اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمھیں روکوں گا نہیں۔ تم خوشی خوشی اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کرو۔ جاتے ہوئے ماں کو بھی آخری بار ملتی جانا۔'' اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تو میری آنکھیں بھر آئیں۔

''کیا آپ مجھے کبھی اس گھر میں آنے نہیں دیں گے؟'' اس نے روتے ہوئے پوچھا۔

''اس گھر کی دیواریں تمھیں ملیں گی، ہم نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ہم اس دُنیا میں رہیں گے تو تم ہم سے ملو گی؟''

''بھیا!'' وہ ڈر کر چلائی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں نینا اگر تم نے یہ شادی کر لی تو ہمارا مرا ہوا منہ دیکھو گی۔ میں تمھارا دشمن نہیں جو ایسی بات کہہ رہا ہوں۔ کل جب تم تکلیف میں ہو گی تو ہم کو بھی تکلیف ہو گی۔ تم جو بھی فیصلہ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ ہمیں سب منظور ہے۔'' میں آنکھوں میں آنسو لیے باہر نکل آیا۔

سارا دن مجھے یہ سوال پریشان کرتا رہا کہ اگر اس نے شادی کر لی تو کیا ہوگا؟ اور اگر وہ رُک گئی تو؟ مجھے معلوم تھا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ میں تو پیار کرنے والی بہن کو Imotionally Blakckmail کر کے آیا تھا۔ شام کو جب میں گھر لوٹا تو دروازہ نینا نے ہی کھولا۔ اس کی سوجی ہوئی سونی آنکھیں، بکھرے بال اور چہرے کا رنگ سر سے پاؤں تک درد میں ڈوبی ہوئی حالت، خاموش شکایت کر رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں: 'محبت کے دشمن ہو تم، ہماری خوشیوں کے لُٹیرے۔'

اسے سامنے دیکھ کر میں خوشی سے پاگل ہوا اٹھا مگر اس کی حالت دیکھ کر میں تڑپ اٹھا۔ میں نے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔ میرا دل رو اُٹھا۔

''میری پیاری بہن تو فکر مت کر۔ میں تیری شادی دھوم دھام سے کروں گا۔ جہاں تو چاہے گی وہیں کروں گا۔ دیوندر سے ہی کروں گا۔ بس اسے تھوڑا سا سدھرنے کا موقع دے دے۔''

لیکن میرے چاہنے پر بھی یہ شادی ہو نہ سکی۔ دیوندر کی انا آڑے آ گئی، اسے تو بس اس بات کا غصّہ تھا کہ وہ طے شدہ تاریخ پر شادی کے لیے نہیں پہنچی۔ دیوندر کا شادی سے انکار کر دینا نینا کو توڑ گیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ چھ مہینے بعد اس کی شادی ورما صاحب کے بیٹے سے ہو گئی اور شادی کے ایک دِن بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی۔ اب تو اس کے بچّے بھی جوان ہو چکے ہیں۔ بہت بار اسے آنے کو کہا مگر وہ پھر لوٹ کر نہیں آئی۔ ماں کے انتقال پر بھی نہیں۔ فون آتے رہتے ہیں مگر خود شاید کبھی لوٹ کر نہ آئے۔

نینا کی شادی ہوئی تو میں نے چین کی سانس لی۔

''شکر ہے بھگوان کا، میں نے اپنے سارے فرض پورے کر دِیے۔''

مگر انسان کی ذمہ داریاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ جب تک وہ زندہ رہتا ہے، فرض کی زنجیر میں جکڑا رہتا ہے۔

حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے ہم دونوں نے آنکھیں بند کرلیں اور زبان پر تالا لگالیا تاکہ گھر کی عزّت کو گھر میں ہی سنبھال کر رکھ سکیں۔ اب ندھی اپنی مرضی سے آتی جاتی تھی۔ وقت بے وقت اس لڑکے کے ساتھ کہاں کہاں گھومتی تھی، ہم نے کبھی پوچھنے کی ہمّت نہیں کی۔ ایک دو بار پوچھنے کی کوشش بھی کی تو بدتمیزی سے پیش آئی۔ اپنی عزّت اپنے ہاتھ بس یہی سوچ کر اس سے سوال جواب بند کردِیے۔ اسے دیکھ کر تل تل مر رہے ہیں۔ بیٹیاں تو ماں باپ کے سکھ کے لیے ہر طرح کا دکھ تکلیف برداشت کرلیتی ہیں مگر یہ نہ جانے کس طرح کی بیٹی ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ اُمت وقت بے وقت کبھی بھی گھر چلا آتا ہے۔ سُمن اپنے کام میں مصروف ہوجاتی ہے اور جب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تو میں گھر سے نکل جاتا ہوں اور بے وجہ سڑکوں پر گھومتا رہتا ہوں۔ مغرب کا اثر بہت تیزی سے ہمارے نوجوانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے اور ہم جیسے والدین، جو اپنی تہذیب نہیں بھول پارہے ہیں، دُکھ کے ساگر میں ڈوب کر اپنا سکھ چین لٹا بیٹھے ہیں۔ میں آج بھی اسی زمانے میں جی رہا ہوں، جہاں بیٹی کو گھر کی عزّت کہا جاتا ہے، جو ماں باپ کی عزّت کی خاطر اپنی جان تک قربان کردیتی ہیں، جس کو شرمِ وحیا کی دیوی کہا جاتا ہے جس کا دل پیار اور ممتا کے جذبہ سے لبریز ہوتا ہے۔ مگر زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے۔ میں سارا قصور اس بدلتے ہوئے زمانے پر نہیں رکھ سکتا، اس میں میرا بھی دوش ہے۔

میں آج اعتراف کرتا ہوں کہ ان حالات کا کچھ حد تک ذمہ دار میں بھی ہوں۔ اگر ندھی آج گمراہ ہورہی ہے تو اس کا گنہگار بھی میں ہی ہوں۔ میں دُنیا بھر کا سکھ اپنی اولاد کو دینا چاہتا تھا۔ اس لیے زیادہ دولت کمانے کے چکر میں یہ بھول گیا کہ ہر سکھ پیسے سے نہیں خریدا جاسکتا۔ بچے کو پیسے کی نہیں وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں اسے لاڈ پیار تو دیتی رہی مگر اس کی خامیوں کو نظر انداز کرتی رہی، اس پر پردہ ڈالتی رہی۔ میں اسے وقت نہ دے سکا اور ماں ٹھیک سے رہنمائی نہ کرسکی۔ آج حالات بگڑ گئے تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے مگر میری بیٹی کے پاس ہمارے لیے وقت نہیں۔ کل وہ میرا انتظار کرتی تھی، آج میں اس کا انتظار کرتا ہوں۔ اس کے لوٹنے کا انتظار کرتا ہوں۔ اس اُمید پر کہ شاید ایک روز وہ بھی نمرتا اور نینا کی طرح میری خطا معاف کردے، جن کی حسرتوں کا، خوابوں کا میں نے بے وجہ گلا گھونٹ دیا، جنھوں نے میری خوشی کی خاطر، میری جھوٹی انا کی خاطر اپنا ہر سکھ قربان کردیا، جن کا میں آج بھی گنہگار ہوں۔

OO

چُٹکی بھر سندُور

پچھلے بیس سال سے شاردا اسی مقام پر کھڑی تھی۔ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ جو پیدا ہوئے تھے وہ جوان ہو گئے، جوان بوڑھے اور بوڑھے دُنیا چھوڑ کر چل بسے اور وہ اُسی مقام پر کھڑی رہی۔ یہ بات نہیں کہ اُس نے کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک پرندے کی مانند جب بھی پنجرہ توڑ کر اُڑنے کی کوشش کی، پر پھڑپھڑائے ناکامی ملی اور تڑپ کر حالات سے سمجھوتہ کرلیا۔ کبھی گھر کی مجبوریوں نے تو کبھی سماج کے ڈر نے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ لیکن وقت تو اپنی تیز رفتاری سے چلتا رہا اور اس کی بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ آس پاس کے ماحول میں، گھر کے ماحول میں، یہاں تک کہ خود اس میں بھی تبدیلیاں آئیں۔ وہ بھی تو اب بیس سال پہلے والی جواں سال شاردا نہ رہ گئی تھی بلکہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت بن گئی تھی۔

جب شاردا اکیس برس کی ہوئی تو ماں باپ نے پوری سنجیدگی سے رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ کوشش تو وہ پچھلے دو سال سے کر رہے تھے مگر اس کے والدین کی خواہش تھی کہ پڑھائی مکمل ہونے کے بعد جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تب اُس کی شادی کر دیں گے۔

مگر شاردا کی سوچ کچھ اور تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بھی ایک چھوٹا سا گھر بسانا چاہتی تھی جس میں ساس سسر ہوں، شوہر ہو، چھوٹے بچّے ہوں مگر یہ سب ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ دل ایسی جگہ لگا بیٹھی تھی جہاں اس کے یہ سب خواب حقیقت میں نہیں بدل سکتے تھے۔ اپنا آشیانہ بنانے کی خاطر کسی کے نشیمن کو جلانا اس کے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ دل میں کوئی اور بسا ہو اور وہ کسی دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر دے، اس طرح خود کو فریب دینا اور دوسرے سے بے وفائی کرنا اُس کے دل نے گوارا نہ کیا۔ وہ ونود کے ماضی اور حال سے اچھی طرح واقف تھی اور جانتی تھی کہ ونود شادی شدہ اور دو بچّوں کا باپ ہے۔ لیکن پیار تو اندھا ہوتا ہے نہ وہ عمر دیکھتا ہے نہ مذہب اور نہ کسی کا رُتبہ، پیار کا انجام شادی ہی تو نہیں، اور دنیا میں ایسے

کتنے لوگ ہیں جن کے نصیب میں سچا پیار ہوتا ہے۔لوگ تو پیار کی چاہ میں پوری عمر اس کے انتظار میں گزار دیتے ہیں۔شادی بیاہ تو صرف ایک رسم ہے۔سات پھیرے اور منگل سُوتر دل کے اور روح کے رشتوں سے زیادہ مضبوط تو نہیں ہوتے۔اسی عقیدے کے ساتھ اُس نے پوری زندگی پیار کے نام کردی۔کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو دُنیا کی سب سے زیادہ خوش نصیب عورت سمجھا۔کیوں نہ سمجھتی جتنا پیار ونود نے اُسے دیا شاید ہی کسی نے کسی کو دیا ہوگا۔ونود کی زندگی میں سب سے اہم وہی تھی، سب سے پہلے وہ، باقی سب بعد میں۔اُس کی بیوی بھی، اُس کے بچے بھی، اگر دونوں میں کبھی تکرار ہو بھی جاتی تو اُس کی وجہ پیار اور اُن کا رشتہ ہوتا۔ونو دا کثر اُس سے کہا کرتا۔

''مجھے تمھارا گھنٹے دو گھنٹے ملنا بالکل پسند نہیں۔''

''تو کیا کیا جائے؟'' وہ شرارت سے کہتی۔

''جانِ من ہم ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔زندگی بہت قیمتی ہے، بہت مختصر ہے اور بڑی مشکل سے ملتی ہے۔اسے یوں گنوانا نہیں چاہیے، اس کی قدر کرنی چاہیے۔کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب میں رات کو سوؤں تو تمھاری بانہوں میں اور صبح جب نیند کھلے تو تمھاری صورت ہی سب سے پہلے نظر آئے۔'' اُس کی آنکھوں میں آرزوئیں مچلنے لگتیں۔

''اگر تم اکیلے ہوتے تو یہ بات ناممکن تو نہ تھی۔''

''اس کے لیے تمھیں دنیا میں دس سال پہلے آنا چاہیے تھا۔''

''تو کیا ہوا تم دس سال بعد شادی کر لیتے۔تمھیں بھی تو بہت جلدی تھی۔''

''یہ قصور میرا نہیں میرے ماں باپ کا ہے۔''

اور اگر بات سچ میں بہت سنجیدہ ہو جاتی تو شاردا ہی اسے حوصلہ دیتی۔

''یہ ہر وقت شادی شادی کی رٹ کیوں لگائے رہتے ہو؟ تمھیں میرے پیار پر اعتبار نہیں ہے کیا؟''

''بات اعتبار کی نہیں ہے۔میں چاہتا ہوں دُنیا یہ جان لے کہ تم میری ہو، تمھیں میں بیوی کا رُتبہ دینا چاہتا ہوں۔میں جانتا ہوں عورت کا جیون ادھورا ہے اگر وہ ماں نہ بن سکے۔میں چاہتا ہوں تم بھی ماں بنو۔''

''کیا تمھارے بچے میرے بچے نہیں؟''

''وہ اس سے ہمدردی کریں گے تم سے نہیں۔ اپنی اولاد ہونا بہت ضروری ہے۔''

''تمھارے پاس ہے نا؟''

''میں اپنی نہیں تمھاری بات کر رہا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔''

''دیکھو ونود مجھے کچھ بھی آدھا ادھورا نہیں چاہیے۔ مجھے ونود پوری طرح چاہیے جو اس جنم میں ممکن نہیں۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تم بٹی ہوئی زندگی گزارو۔ ہفتے میں دو دن میرے پاس تو چار دن اُس کے پاس اور میں باقی کے دن تمھارے انتظار میں کاٹ دوں۔ اب تو مجھے اس بات کا پتہ ہے کہ تم میرے ہوکر بھی میرے نہیں اس لیے میں نے اپنی خواہشیں محدود کر لی ہیں۔ اگر میں نے ان کی لگام ڈھیلی کر دی تو نہ صرف میں بلکہ تم بھی تنگ ہو جاؤ گے۔'' جو باتیں شاردا سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی وہ مجبوراً اسے ان سے آگاہ کرانا اپنا فرض سمجھتا۔

''میں تم سے عمر میں بڑا ہوں اور مجھے زندگی کا تجربہ بھی تم سے زیادہ ہے۔ اگر تم مجھے کسی سے نہیں بانٹ سکتی تو تم شادی کر لو۔ اپنا گھر بسا لو۔ میرے دل سے بوجھ ہٹ جائے گا۔''

''کیسا بوجھ۔''

یہی کہ میرے پاس تو گھر بھی ہے، بیوی بھی اور بچّے بھی، مگر تمھارے پاس کیا ہے؟''

''تم ہو نا۔''

''میں تو تمھارے لیے ہمیشہ آدھا ادھورا ہی رہوں گا۔''

''میں نے تم سے پیار کیا ہے۔ یہ دل، جسم اور جان سب تو تمھارے ہیں پھر کسی اور کو دینے کے لیے میرے پاس ہے ہی کیا؟ تم میرے ہو، بس زندگی کاٹنے کے لیے یہ سہارا ہی بہت ہے۔''

''نادانی کی باتیں کرتی ہو۔''

''تم سے ایک چیز مانگوں دو گے؟''

''جان مانگو، یہ جان بھی تمھاری ہے۔''

''تم سلامت رہو، تمھاری جان لے کر میں کیا کروں گی۔ بس یہ وعدہ کرو کہ مجھے اسی طرح پیار کرتے رہو گے اور زندگی کی آخری سانسوں تک میرا ساتھ دو گے۔ کبھی پیٹھ نہیں دکھاؤ گے۔'' شاردا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میں وعدہ کرتا ہوں تمھیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ اپنی آخری سانسوں تک

تمھیں اسی طرح دل و جان سے پیار کروں گا۔'' ونود نے اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر چومتے ہوئے کہا۔

ونود نے اُسے اتنا پیار دیا کہ اُسے کبھی کسی اور کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اُسے اپنی زندگی مکمل لگتی۔ اُسے کبھی اس بات کا رنج نہیں ہوا کہ وہ ماں نہیں بن سکی۔ وہ اکیلی ہے۔ وہ کبھی اکیلی تھی بھی نہیں۔ اُس نے جب کبھی ونود کو یاد کیا وہ اُسی وقت سب کام چھوڑ کر اُس کے پاس آ پہنچا۔ اس نے ونود کو کبھی خود سے دور محسوس نہیں کیا۔ ہر شام وہ ساتھ ہوتے اور رات ہوتے ہی وہ اپنے گھر لوٹ جاتا اور شاردا اس کے ساتھ گزارے لمحے یاد کرتی کرتی سکون کی نیند سو جاتی۔ پریشانی تو اُسے اُس وقت ہوتی جب کبھی آدھی رات کو اُس کی نیند اچانک ٹوٹ جاتی۔ رات کے خاموش اندھیرے سائے اس کے دل میں ہلچل مچا دیتے۔ اُس وقت اُسے وِنود کی دوری کا احساس ہوتا۔ دل کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ اُس کی پہنچ سے دور ہے یہ بات خار کی طرح اس کے سینے میں چبھتی اور سینے کا درد آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگتا۔ رات رو رو کر آنکھوں میں ہی کٹ جاتی۔ صبح تک سوجی ہوئی آنکھیں رات کا سارا قصہ خود بخود بیان کر دیتیں۔

''کل رات کو تم سوئیں نہیں کیا؟'' ونود اُسے دیکھتے ہی پوچھتا۔

''نیند نہیں آئی۔''

''کیوں؟''

''تنہائی سے جی گھبرا گیا۔''

''مجھے تمھاری فکر ہونے لگی ہے شاردا۔ تم اگر میرا کہا مان لو تو میں رات کبھی کبھی تمھارے پاس رُک جایا کروں؟''

''نہیں، کبھی نہیں۔ تمھارے بچّے بڑے ہو رہے ہیں۔ تمھاری بیوی سب جانتی ہے پھر بھی وہ خاموش رہتی ہے صرف اس وجہ سے کہ تم رات کو گھر لوٹ جاتے ہو۔ اگر تم نے یہ بھی شروع کر دیا تو گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہو جائے گا اور بچّے بھی سب جان جائیں گے اور بڑھتے بچّوں پر ان باتوں کا کیا اثر ہوگا کیا تم نہیں جانتے۔ اپنی تھوڑی سی خوشی کے لیے ہم اتنے لوگوں کو دُکھ نہیں دے سکتے۔''

''تم سب کے بارے میں سوچتی ہو اپنے بارے میں کیوں نہیں سوچتیں؟''

''میں اور تم الگ الگ تو نہیں ہیں۔ کیا ہوا اگر میں نے تمھارے ساتھ سات پھیرے نہیں لیے، تمھارا دُکھ میرا دُکھ، تمھاری تکلیف میری تکلیف۔ پھر میں تمھارے گھر والوں کو کیسے دکھ دے سکتی ہوں۔ تم فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

ونود یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ شاید وقت ہی اس کا کوئی حل نکالے گا۔ وقت کو نہ رُکنا تھا نہ رُکا۔ لمحے پر لگا کر اُڑ جاتے ہیں۔ بچّے جوان ہوئے تو اُن کی جوانی ڈھل گئی۔ دُنیا کا یہ دستور رہا ہے کہ جب بڑھاپا جوانی پر چھا جاتا ہے تو جوان بزرگوں پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا علم بھی انھیں جوانی ڈھل جانے کے بعد ہوا۔ بڑھتی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ونود کی مجبوریاں بھی بڑھتی گئیں۔ اب اس کے پاس وقت کی کمی ہوگئی اور اگر کبھی شاردا اس بات کا گلہ کر دیتی تو وہ ناراض ہو جاتا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کچھ فرض میرے گھر والوں کی طرف بھی ہیں۔ اُن کو بھی دیکھنا ہے۔ اُن کو بھی تو کچھ وقت چاہیے۔''

غصّے سے وہ منہ بنا کر بیٹھ جاتا۔ اور شاردا بات کو بگڑنے سے بچانے کے لیے غصہ پی جاتی اور کوئی اِدھر اُدھر کی بات شروع کر دیتی۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے شکوہ کرنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیشہ کی طرح اُسے یہی سننے کو ملے گا۔

''شاردا تم سمجھ دار ہو، میرے ہر سُکھ دُکھ میں تم شریک رہی ہو، تم سے میری زندگی کا کوئی بھی پہلو چھپا ہوا نہیں ہے۔ اب بچّے جوان ہو رہے ہیں تو بتاؤ میں کیا کروں؟ جوان خون ہے بہت جلدی اُبل پڑتا ہے۔ تم تو جانتی ہو بیٹا ماں کا کتنا لاڈلا ہے اس لیے میں کوئی ایسا موقع نہیں دینا چاہتا کہ جو زبان کا پردہ ابھی تک باپ بیٹے میں ہے وہ بھی ہٹ جائے۔''

''لیکن میں خود کو کیسے سمجھاؤں؟''

''تم کہتی تھیں کہ میرا پیار ہی تمھارا سہارا ہے، تو میرے پیار میں کمی تو نہیں آئی۔ آج بھی میں تمھیں اُسی طرح چاہتا ہوں جیسے بیس سال پہلے چاہتا تھا۔ تم تو میرے جینے کا سہارا ہو۔''

ونود کی پیار بھری باتیں سُن کر شاردا پھر سے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیاّر ہو جاتی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دن بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ شاردا کے پاس صرف ماضی کی میٹھی میٹھی یادیں تھیں جو اُس کے جینے کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔ مگر جن باتوں کو یاد کر کے وہ خوش ہوا کرتی تھی آج وہی باتیں اُسے خون کے آنسو رُلا رہی تھیں۔

ہر سال کی طرح اس بار بھی ۱۱ر دسمبر کو دونوں نے باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ پچھلے بیس سال سے یہ دن وہ دونوں گھوم پھر کر اکٹھے بتاتے تھے اور پُرانے دنوں کو یاد کر کے خوش ہوتے تھے۔ بیس سال پہلے اسی دن اُنھوں نے پیار کا اقرار کیا تھا اور پھر یہ تاریخ اُن کے لیے خاص ہوگئی تھی۔ وعدے کے مطابق ونود صبح گاڑی لے کر اُسے لینے آ گیا لیکن چہرے پر خوشی کا نام ونشان نہ تھا۔ اُس کی اُڑی رنگت دیکھ کر شاردا پریشان ہو اُٹھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُس نے پوچھا: ''طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟''

''طبیعت تو ٹھیک ہے، پر گھر میں پریشانی ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''معلوم نہیں اُنھیں کیسے پتہ چل گیا، صبح سے ہی گھر میں جھگڑا ہو رہا ہے۔''

''کیا ہم پہلی بار کہیں باہر جا رہے ہیں؟''

''بات یہ نہیں ہے۔ کچھ دنوں سے ماں اور بیٹا دونوں ہی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کر رہے ہیں۔ بات بات پر طعنہ دیتے ہیں۔ گھر کا ماحول خراب ہو جاتا ہے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

''پھر؟''

''پھر کیا؟ آج ہم صرف ایک گھنٹے کے لیے باہر گھومنے چلیں گے۔ آج سے پہلے انھوں نے کبھی ایسے سوال نہیں پوچھے کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ کس کے ساتھ جا رہا ہوں اور کب تک لوٹ آؤں گا؟ بس ضروری کام کا بہانہ کر کے آیا ہوں۔'' وہ پریشانی کی حالت میں بولے جا رہا تھا۔

''آنا کوئی ضروری نہیں تھا۔ اتنے ہی ڈرتے ہو تو فون پر منع کر دیتے۔'' شاردا غصّے سے بولی۔

''نہ آتا تو تم ناراض ہو جاتیں۔''

یہ سنتے ہی وہ چپ ہوگئی۔ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ وہ صرف اس لیے آیا ہے کہ اُسے بُرا لگے گا ورنہ اس دن کی اُس کے لیے اب کوئی خاص اہمیت نہیں۔ سارے راستے دونوں نے کوئی بات نہیں کی اور ایک گھنٹے بعد وہ اُسے گھر چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ اُسے اس بات کی فکر نہیں تھی کہ شاردا کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی بلکہ اُسے گھر جلدی لوٹنے کی فکر تھی کہ کہیں اُس کی چوری پکڑی نہ جائے اور گھر کا ماحول بھی پُرسکون رہے۔

آج بیوی کو خوش کرنے کے لیے پہلی بار اس نے شاردا کی پروانہیں کی۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ جن ہاتھوں میں اس کا مستقبل تھا وہ ہاتھ کمزور ہو گئے ہیں، اُن کی پکڑ میں وہ مضبوطی نہیں رہی۔ آج پہلی بار دل زخمی ہوا تھا اور وہ تنہا اپنے کمرے میں دل کھول کر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ آنکھوں سے آنسو بہہ چلے تو سب کچھ صاف صاف نظر آنے لگا۔ ابھی مہینہ بھر پہلے ہی کی بات ہے کہ جب دو دِن ونود سے کوئی بات نہ ہو سکی اور نہ ہی فون پر کوئی رابطہ قائم ہو سکا تو ملنے پر اس نے اس بات کا گلہ کر دیا:

''کہاں رہے دو دِن؟ نہ ملے نہ فون کیا؟ معلوم نہیں تمھیں کتنی پریشان ہو اٹھتی ہوں جب تمھاری کوئی خبر نہیں ملتی؟''

''بس یونہی بچوّں کی ضد پر شملہ چلا گیا تھا؟''

''اکیلے؟''

''نہیں وہ میرے ساتھ گئی تھی۔ دراصل بچوّں نے مل کر ہماری شادی کی سال گرہ منانے کا فیصلہ کیا اور مجھے بنا بتائے ٹکٹ بھی لے آئے اور ہوٹل بھی بک کرا دیا۔ جلدی جلدی میں مَیں تمھیں بتا نہ سکا۔'' ونود نے نظریں نیچے کیے ہوئے جواب دیا۔

''ہوں!'' شاردا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اب میں بھی کیا کروں۔ اُس کے بھی تو کچھ ارمان ہیں۔ اگر میں پورا نہیں کروں گا تو کون کرے گا؟'' ونود نے صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''وہاں اُس کے ارمان ہیں یہاں میرے۔ آج یہ تو بتا دو کہ تمھارے سچّے جذبات کس طرف ہیں۔ تم پیار کس سے کرتے ہو؟'' شاردا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''اس میں غصّے کی کیا بات ہے۔ اگر گھر میں کوئی جانور بھی پالتے ہیں تو اُس سے بھی پیار ہو جاتا ہے وہ تو پھر انسان ہے۔ میرے بچوّں کی ماں۔''

شاردا کو اس طرح کے جواب کی بالکل اُمید نہ تھی۔ وہ حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہ گئی۔ پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ شادی صرف ایک رسم نہیں بلکہ ایک مضبوط بندھن ہے جو کئی طوفانوں کے بعد بھی ٹوٹتا نہیں اگر اُس رشتے کو نبھانے کی کوشش کی جائے۔ آدمی کی فطرت تو ایک پرندے کی مانند اُڑان بھرنے کی ہے مگر شام کو لوٹ کر وہ واپس اپنے گھروندے میں ہی آتا ہے۔ وہ ساری عمر پیار کو ہی اہم سمجھتی رہی یہ نہ سمجھ سکی کہ جس رشتے کا

کوئی نام نہیں وہ رشتہ پائدار کیسے ہوسکتا ہے؟

اس کا یہ یقین اس دن اور پختہ ہوگیا جب ونود ایک سڑک حادثہ میں بُری طرح زخمی ہوگیا اوراس کی خبر دو دن بعد اسے کسی جاننے والے سے ملی۔ خبر سنتے ہی وہ اسپتال بھاگی۔ ایمرجنسی کے باہر ونود کے کچھ رشتے دار اور بچے کھڑے تھے، اسے دیکھتے ہی جن کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے اور آنکھوں سے نفرت جھلک رہی تھی۔ وہ ان سب کی پروا کیے بنا کمرے کے اندر گھس گئی۔ ونود زخمی حالت میں بے سدھ پڑا تھا۔ بازو میں بوتل لگی تھی۔ چہرہ بُری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ چوٹ سر پر زیادہ لگی تھی اور ابھی تک اسے ہوش نہیں آیا تھا۔ ونود کی ایسی حالت دیکھ کر وہ دیوانوں کی طرح رونے لگی اور جیسے ہی بے خودی میں وہ اُس کی طرف بڑھی ونود کی بیوی نے اُس کو بازوؤں سے تھام لیا اور کہا۔

''ڈاکٹروں نے ان کے پاس جانے سے منع کیا ہے۔ آپ باہر سے حال پتہ کرلیں۔''

اُس کی آواز میں اتنا رعب تھا کہ شاردا کے قدم وہیں رُک گئے اور اسے یاد آ گیا کہ وہ ونود کی بیاہتا نہیں۔ اس کا رشتہ تو بے نام ہے جس کی سماج میں کوئی عزّت نہیں۔ اور وہ بوجھل قدموں سے باہر برآمدے میں دیوار کے ساتھ لگ کر اس لمحے کا انتظار کرنے لگی جب ونود ہوش میں آئے گا۔ نہ جانے اُسے کب ہوش آئے اور اگر ہوش آ بھی گیا تو وہ اُسے پہچان پائے گا بھی کہ نہیں؟

OO

ممتا

''آج میرے بیٹے کی طبیعت کیسی ہے؟ میرے چاند کو بخار تو نہیں ہے۔ میرا پیار میرا دلار، تُو ذرا سا بیمار ہوتا ہے تو میری جان ہی نکل جاتی ہے۔ تُو تو جانتا ہی ہے تیرے علاوہ میرا اس دُنیا میں ہے ہی کون؟''

سنگیتا روئے بھی جا رہی تھی اور اسے پیار بھی کیے جا رہی تھی۔

''کیا کھائے گا میرا بیٹا؟ میں کیا بناؤں تیرے لیے؟ آج تو کھانا ضرور کھا لینا پھر دوا بھی تو لینی ہے۔ بھوکے پیٹ دوائی نہیں لیتے معلوم ہے تجھے۔'' سنگیتا اُٹھ کر باورچی خانہ میں گئی اور اپنے اور اس کے لیے ناشتہ بنا کر لے آئی۔ مگر جب اس نے کھانا دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا تو مجبوراً اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھلانا پڑا۔

''بیٹا! تجھے معلوم ہے نا تیری مما کو دفتر جانے میں دیری ہو جائے گی۔ جلدی سے کھا لے میرے چندا۔ آ میں تجھے اپنے ہاتھوں سے کِھلا دوں۔ شاباش۔ میرے لاڈلے۔ جلدی سے سب ختم کر دو۔ مما کو دفتر جانا ہے نا۔''

کھانا کھلا کر دوائی بھی کھلا دی۔ اور دفتر نکلنے سے پہلے سب ہدایتیں دے دیں۔

''میرے جانے کے بعد آرام سے رہنا، کوئی شرارت نہیں کرنا بس، بخار اتر جائے گا تو جتنی مرضی شرارتیں کرنا، میں بالکل منع نہیں کروں گی۔'' اس کے ماتھے کو چوم کر وہ دفتر کے لیے نکل پڑی۔

آج اسے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ دفتر پہنچتے ہی وہ ڈاکٹر سنگھ سے فون پر بات کرے گی اور اگر دوا بدلنی ہوئی تو بدل دے گی۔ وہ پچھلے بیس سال سے اسی دفتر میں نوکری کر رہی ہے۔ مگر اتنا سخت افسر پہلی بار آیا ہے۔ اگر اسے بلا لیا ہوا تو آج تو ڈانٹ پڑ ہی جائے گی۔ اگر اس نے ڈانٹا تو وہ پورے دن کی چھٹی لے کر بیٹے کے پاس گھر چلی جائے گی۔ آخر بچہ بیمار ہو تو چھٹی تو

چاہیے ہی۔ یہی سب سوچتی ہوئی وہ دفتر پہنچ گئی۔

سب سے پہلے شرما جی نے روک لیا۔

''میڈم! کیا بات ہے۔ آپ دو دن سے چھٹی پر تھیں۔ سب خیریت تو ہے؟''

''کیا بتاؤں شرما جی میرے چاند کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ بخار اُترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پھر ڈاکٹر کو دکھایا اور اب کچھ آرام ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں گھر میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ پھر اتنے بخار میں اسے تنہا چھوڑ کر کیسے آجاتی۔'' بات کرتے کرتے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''میڈم! آپ روئیں نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بخار تو آتا جاتا رہتا ہے۔ اب اُتر گیا بخار؟''

''اب تو ٹھیک ہے۔ آج تین دن بعد اس کے حلق سے کھانا اُترا ہے۔ وہ بھی خود اپنے ہاتھوں سے کھلایا تو اس نے کھایا۔'' اس نے چین کی سانس لی۔

''بھگوان اسے جلدی تندرستی دے۔''

''آمین۔'' شرما جی کے ساتھ بیٹھے ان کے دوست اقبال میاں نے کہا۔

''میڈم آپ کو صاحب یاد کر رہے ہیں، بہت غصے میں ہیں۔ پہلے بھی دو بار بلا چکے ہیں۔'' چپراسی نے آ کر کہا۔

''آرہی ہوں۔تم جاؤ۔''

جانے سے پہلے وہ پھر شرما جی سے مخاطب ہوئی۔ اسے شرما جی کے سلجھے ہوئے مشورہ پر بہت بھروسہ تھا۔

''شرما جی اگر صاحب زیادہ غصے میں ہیں تو میں چھٹی لے کر چلی جاؤں؟''

''نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ اندر جائیں اور صاحب کو جا کر اپنی پریشانی کا سبب بتائیں گی تو وہ کچھ نہیں کہیں گے۔''

''شکریہ شرما جی۔'' یہ کہہ کر وہ صاحب کے کمرے میں چلی گئی۔

اقبال میاں جو پہلی مرتبہ شرما جی کے دفتر آئے تھے اس کے جاتے ہی پوچھنے لگے۔

''بہت بیمار ہے کیا؟ بڑی پریشان لگ رہی تھیں۔''

''بخار ہوگا تبھی تو دو دن کی چھٹی لی ورنہ بنا مطلب کے کبھی چھٹی نہیں لیتی۔ بہت محنتی

عورت ہے۔'' کاغذ دیکھتے ہوئے انھوں نے جواب دیا۔

''گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟''

''نہیں، اکیلی رہتی ہیں، شادی نہیں کی۔'' کام کرتے کرتے انھوں نے جواب دیا۔

''شادی نہیں کی؟ تو یہ بچّہ کس کا ہے؟'' انھوں نے حیرت سے پوچھا۔

''کون سا بچّہ؟'' شرما جی نے کام چھوڑ دیا۔

''جس بیمار بچّے کی بات وہ کر رہی تھیں؟''

''وہ؟'' شرما جی کھلکھلا اٹھے۔ اور اقبال میاں پریشان ہو گئے جب ہنسی تھم گئی تو بولے۔

''وہ تو میڈم کا کتّا ہے جس کی ہم بات کر رہے تھے۔'' اقبال میاں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

OO

شاخِ گُلاب پر کیکٹس

ڈھولک کی تھاپ پر جوان لڑکیاں ناچ ناچ کر زمین توڑ رہی تھیں۔ ادھیڑ عمر کی عورتیں ایک دوسرے سے مذاق کر رہی تھیں اور ہنسی کی جھنکار سے گھر گونج رہا تھا۔ دوسرے کونے میں بزرگ عورتیں ہلکی مرجھائی ہوئی آواز میں سہاگ کے گیت گا رہی تھیں۔ ماں کے کان ہر آنے والی گاڑی کی آواز سن کر کھڑے ہو جاتے اور وہ بے تابی سے دروازے کی طرف لپکتی۔ دِپتی نے ڈھولک بجاتے بجاتے ماں کی یہ حالت دیکھ کر اسے چھیڑا۔

''ماں بھیّا دلہن لے کر سیدھے گھر ہی آئیں گے کہیں اور نہیں لے جائیں گے۔ آ کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

''اب تک تو ان لوگوں کو آ جانا چاہیے تھا'' ماں فکرمند تھی۔

''دُور کا سفر ہے، وقت تو لگتا ہی ہے۔ بھابی آپ ادھر آؤ ہمارے پاس۔ آپ کے دیور کی شادی ہے ذرا کچھ ناچ گانا ہو جائے'' جیسے ہی سروج ڈھولک پر بیٹھنے لگی ساس نے آواز دے دی۔

''سروج ذرا چائے کا انتظام تو کرو۔''

''ابھی کرتی ہوں ماں۔'' اسی پاؤں وہ باورچی خانے لوٹ گئی۔

شادی کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اور گھر کی بڑی بہو ہونے کی وجہ سے سب کی خاطر داری کا ذمہ اسی کے سر تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ سج سنور کر وہ بھی بیٹھ کر گیت گاتی یا دیور کی شادی میں ناچ کرتی۔ ویسے بھی اسے رشتے داروں میں بیٹھنے سے گھر کا کام کرنا زیادہ پسند تھا۔ اگر کبھی وہ غلطی سے بیٹھ جاتی تو سبھی عورتیں خاموش ہو جاتیں اور اسے لگتا جیسے وہ اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اسے دیکھ کر جن عورتوں کے ناک بھوں چڑھ جاتے وہ انھیں ان دیکھا کر دیتی۔ دِل پر پتھر رکھ کر سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی۔ لیکن اپنے دل کا بوجھ ہلکا

کرنے کے لیے کبھی اپنے کمرے میں تو کبھی غسل خانے میں رو آتی۔ دراصل یہ عورتیں اسے چھوٹی ذات کی سمجھتی تھیں۔ کتنا بھی پڑھ لکھ لیا پر چھوٹی ذات کا جو لیبل لگا ہوا تھا وہ نہ مٹ سکا اور ہمارے معاشرے میں خود کو اعلیٰ درجہ کا بتانے والے لوگ، جنھیں ہم الٹرا موڈرن کہہ سکتے ہیں، وہ بھی اس بیماری سے نہیں بچ سکے۔ ان کو اپنے اعلیٰ خاندان اور خون پر فخر ہے جبکہ خون کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے۔

شادی میں شرکت کے لیے سب رشتہ دار دُور دُور سے پہنچے تھے۔ گھر میں پہلی بار دھوم دھام سے دلہن کو لانا تھا۔ رمیش نے تو کسی کو شادی میں آنے کا موقع ہی نہیں دیا اور چپ چاپ سروج کو بیاہ کر لے آیا۔ ماں کا کوئی ارمان پورا نہ ہو سکا۔ اس لیے وہ ہر ارمان چھوٹے بیٹے کی شادی میں پورا کرنا چاہتی تھی۔ اتنے میں بچے شور مچاتے اندر داخل ہوئے۔ ''دلہن آگئی، دلہن آگئی۔''

سبھی عورتیں دروازے کی طرف لپکیں اور ماں سب کو دھکا دے کر دروازے کے آگے جا کھڑی ہوئی۔

''سروج! جلدی سے پانی لا۔ تیل لا اور آرتی والا تھال بھی۔ جلدی کر سروج دیکھ بہو دروازے تک آگئی۔'' ماں کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ آواز میں تھرتھراہٹ بھی تھی۔ سروج بھاگی بھاگی بہو کے استقبال کا سامان لے آئی۔ ماں نے آرتی اُتاری، شگن کیے اور بلائیں لیں۔ اتنی بھیڑ میں صرف رمیش تھا جو سروج کے چہرے کے ہر اُتار چڑھاؤ کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بظاہر شانت دِکھائی دینے والی سروج کے دل میں کیا طوفان اٹھ رہے ہوں گے۔ رمیش سے نظریں ملتے ہی سروج نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ وہ کچھ سمجھ نہ سکے۔ لیکن رمیش تو اس کی ہر سانس سے واقف تھا۔ جتنا پیار سروج نے اسے دیا تھا اتنی تو اس نے کبھی توقع بھی نہ کی تھی۔ تبھی تو وہ پیار سے اسے ''پیار کا ساگر'' کہتا تھا۔

''تم جانتی ہو میں تمھیں پیار کا ساگر کیوں کہتا ہوں؟''

''کیونکہ میں تمھیں بے حد پیار کرتی ہوں۔''

''نہیں ساگر اس لیے کہ تمھارے پاس پیار کا خزانہ بھرا ہوا ہے جو تم نہ صرف مجھے بلکہ گھر میں سب کو ان کے حصّے کا انھیں دیتی ہو، اور یہ کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔ ساگر کبھی خالی نہیں ہوتا۔''

سبھی عورتیں دُلہن اور دلہے کو لے کر اندر چلی گئیں اور باقی رسوم پوری ہونے لگیں۔
رمیش کھلی آنکھوں سے سب دیکھتا رہا مگر اس کا ذہن پانچ سال پیچھے چلا گیا۔

رمیش اور سروج کی ملاقات ٹرین میں سفر کے دوران ہوئی۔ سروج انٹرویو کے سلسلے میں چنڈی گڑھ سے شملہ جا رہی تھی۔ اس نے بی اے، بی ایڈ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا اور ایک اسکول میں اس کا انٹرویو تھا۔ بے روزگاری اتنی بڑھ گئی ہے کہ اچھے نمبر لے کر پاس ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ کئی جگہ درخواست بھیجی مگر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے بلاوا آیا تھا۔ ماں تو نوکری کے خلاف تھی مگر پھر بھی وہ اسے سمجھا بجھا کر چلی آئی تھی۔ کیونکہ اس کے پتا کا یہ خواب تھا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے، کسی کی محتاج نہ رہے۔

نئی جگہ پر اکیلے جانے کا خوف اور پہلی مرتبہ اکیلے سفر پر جانے کی پریشانی اُس کے چہرے پر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ٹرین روانہ ہوئی تو اس نے پڑھنے کے لیے کتاب نکال لی اور خود کو مصروف کر لیا مگر جب کبھی دور بیٹھے ان پانچ لڑکوں کا شور سنائی دیتا تو اس کا دھیان بھی اس طرف چلا جاتا۔ سارے ڈبے میں ان لوگوں کا ہی شور تھا۔ لگتا تھا چھٹّیاں منانے جا رہے ہیں۔ بات بات پر فضول قہقہے لگا رہے تھے۔ سبھی لوگ ان کو دیکھ رہے تھے۔ تاش چل رہی تھی پھر بیئر کی بوتلیں بھی کھل گئیں۔ اس پر جب ایک بزرگ نے اعتراض کیا تو وہ اس کا بُری طرح مذاق اُڑاتے ہوئے اُسے پریشان کرنے لگے۔ اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہے یہ سوچ کر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ ان لوگوں کی ہلڑ بازی دیکھ کر وہ اور پریشان ہو گئی۔ سردی کے موسم میں بھی اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔ ایک نوجوان اسے دیر سے گھورے جا رہا تھا۔ باقی ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا اس تک پہنچ گیا۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ سہم کر وہ آگے کھسک گئی۔

''آپ شملہ جا رہی ہیں؟'' اس نے اور ساتھ چپکتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں'' آواز اس کے حلق میں اٹک گئی تھی۔

''آپ اکیلی جا رہی ہیں؟'' وہ اور قریب آیا۔

اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی اس کی مدد کے لیے آئے مگر سب خاموش بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ اور حاوی ہونے لگا۔

''ایسے موسم میں اکیلے سفر نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ کو کمپنی دینے ہی آیا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی ایک نوجوان نے اس لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا: ''اس کی کوئی ضرورت نہیں یہ میرے ساتھ ہیں۔ آپ کو کوئی کام ہے کیا؟''

آواز میں رعب اور کاندھے پر مضبوط گرفت محسوس کر کے وہ گھبرا اٹھا اور سٹپٹا کر اُٹھ بھاگا۔ سروج نے چین کی سانس لی اور نگاہوں سے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ کافی دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر نارمل ہو کر سروج نے شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھا۔

''آپ اگر میری مدد کو نہ آتے تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔''

''میں نہ آتا تو کوئی دوسرا تمھاری مدد کر دیتا۔''

''سب تو تماشا دیکھ رہے تھے۔ خیر! آپ کا بہت بہت شکریہ!''

''اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں مگر آئندہ اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنالو کہ کہیں کسی مدد کی ضرورت نہ پڑے۔ کمزور انسان کو لوگ ڈراتے ہیں۔ اگر سر اٹھا کر جینا چاہتی ہو تو ڈر کو دل سے نکال پھینکو۔''

''جی آئندہ کوشش کروں گی۔''

''میرا نام رمیش ہے اور میں شملہ کا ہی رہنے والا ہوں۔ شملہ میں کہاں جانا ہے آپ کو؟''

اس تعارف کے بعد باتوں کا سلسلہ چل نکلا اور باقی کا سفر کتنی جلد کٹ گیا انھیں پتا ہی نہ چلا۔ سروج پہلی مرتبہ شملہ آئی تھی اس لیے وہ وائی ڈبلیو سی اے ہوسٹل تک اسے حفاظت سے چھوڑ کر آیا۔

''دوبارہ ملاقات ہوگی کیا؟'' سروج نے جاتے ہوئے رمیش سے پوچھا۔

''اب تو ملنا پڑے گا، فرصت ملتے ہی آؤں گا۔''

جس انداز سے رمیش نے آنے کا وعدہ کیا اس سے اس کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا اور نظریں خود بخود جھک گئیں۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ کب ان کی دوستی نے پیار کا رنگ لے لیا انھیں پتہ ہی نہ چلا۔ جس روز سروج سے اس نے پیار کا اظہار کیا وہ چونک اٹھی۔

شام کا وقت تھا، سورج ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے ماحول میں ایک عجیب سی خوشبو لیے چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی چاندنی اس ماحول کو اور رومانی بنا رہی تھی۔ دونوں خاموش قدم سے قدم ملائے چلے جا رہے تھے کہ رمیش نے بے خودی میں اس کا ہاتھ تھام لیا، اس نے بھی ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔

''تم ساتھ ہو تو سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔''

''مجھے بھی'' سروج نے دھیمے سے جواب دیا۔

''جانتی ہو بات کرنے کے لیے الفاظ ضروری نہیں ہوتے کبھی کبھی خاموشی بھی باتیں کر لیتی ہے۔''

''ہوں۔''

''کیا ہم زندگی بھر اسی طرح ساتھ چل سکتے ہیں؟''

سروج کو ایک جھٹکا سا لگا اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور رمیش کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ پریشان ہو اٹھا۔ ''میں نے کوئی غلط بات کہہ دی کیا؟''

''نہیں'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''تم رو رہی ہو کیا؟ سروج پلیز مجھے معاف کر دو۔ اس طرح روؤ نہیں۔ مجھ سے تمھارے یہ آنسو نہیں دیکھے جاتے۔'' اس کے رخسار سے آنسو پونچھتے ہوئے رمیش بولا۔

''مجھے معاف کر دو اور چپ ہو جاؤ۔''

کچھ پل کی خاموشی کے بعد سروج نے جواب دیا۔ ''معافی تمھیں نہیں مجھے مانگنی چاہیے، تم نے تو کچھ غلط نہیں کیا، پر مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اس بات کا علم ہی نہیں ہوا کہ میں کب تم سے پیار کرنے لگی۔ میں تو سوچتی تھی کہ ہم اچھے دوست ہیں اور مجھے تمھارا ساتھ پسند ہے مگر اب محسوس کر رہی ہوں کہ نہ جانے کب تم میری ضرورت بن گئے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے، اس میں رونے کی کیا بات ہوئی'' رمیش نے خوش ہو کر کہا۔

''میں تمھارے قابل نہیں۔ میں تم سے دوستی کر سکتی ہوں پیار بھی کر سکتی ہوں مگر شادی نہیں۔ تم ایک اونچے خاندان کے بڑے بیٹے ہو، اور میں نہ صرف غریب ماں باپ کی بیٹی ہوں بلکہ جس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں اُسے دلت یا شیڈولڈ کاسٹ کہتے ہیں۔ تم سے شادی کر کے میں تمھارے خاندان کے خون کو گندہ نہیں کر سکتی۔''

''یہ تم کیسی باتیں کرتی ہو۔ پیار کا کوئی مذہب، کوئی ذات نہیں ہوتی۔ اور پھر کیا کمی ہے تم میں۔ خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو۔ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو۔ سلیقہ مند ہو۔ پھر خاندانی لڑکیاں بھی تو ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ اتنی سی بات تھی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ تم ابھی کہہ دو گی کہ میری شادی تو ہو چکی میں تو دو بچوں کی ماں ہوں۔'' اس نے شرارت سے کہا۔

''ہٹو بھی! اتنی سنجیدہ بات کو مذاق میں مت اُڑاؤ'' روتے روتے وہ ہنس پڑی۔
''تم نے کہہ دی، میں نے سن لی، بات ختم ہوئی۔ اب اچھی اچھی باتیں کرو۔ ہاں تو یہ بتاؤ کتنا پیار کرتی ہو مجھ سے۔''

رمیش نے باتوں کا رُخ بدل دیا۔ اسے وومنز ہوسٹل چھوڑ کر جب گھر لوٹ رہا تھا تو سارے راستے یہی سوچتا رہا کہ اب کیا ہوگا۔ سروج کا دل رکھنے کو اس نے کہہ تو دیا پر یہ بات اتنی آسان نہیں۔ اگر سب لوگ مان بھی گئے تو بھی ماں کبھی نہ مانے گی۔ وہ کسی بھی حالت میں نہ سروج کو چھوڑ سکتا ہے اور نہ اپنے گھر والوں کو۔ اسی پریشانی میں کچھ روز نکل گئے۔ آخر اسے جس بات کا ڈر تھا وہی ہوا۔ یہ بات سنتے ہی گھر میں وبال کھڑا ہوگیا، ماں نے صاف لفظوں میں کہہ دیا۔

''چھوٹی ذات کی لڑکی چاہے کتنی بھی خوبصورت پڑھی لکھی کیوں نہ ہو، ہمارے خاندان کی بہو نہیں بن سکتی۔''

''ٹھیک ہے آپ اسے اپنی بہو مت سمجھنا، میری شادی ہوگی تو صرف سروج سے ہوگی۔ آپ لوگ اگر رضامند نہیں ہوئے تو بھی یہ شادی ضرور ہوگی۔ یہ میرا بھی آخری فیصلہ ہے۔ میں ذات پات میں یقین نہیں رکھتا۔''

''مگر ہم مانتے ہیں خون ہمیشہ اپنا رنگ دکھا کر رہتا ہے۔''

''خون کا رنگ ایک ہوتا ہے ماں۔ غریب کا بھی اور امیر کا بھی دونوں کا خون لال ہوتا ہے۔ بات خون کی نہیں سنسکاروں کی ہوتی ہے۔ انسان کے سنسکار اچھے ہونے چاہئیں۔ اور جو خوبیاں ایک شریکِ حیات میں ہونی چاہئیں وہ سب مجھے اس میں نظر آتی ہیں۔''

''تجھے دیر ہی کتنی ہوئی ہے اسے جانے ہوئے؟''

''کسی کو جاننے کے لیے کبھی کبھی سال گزر جاتے ہیں تو کبھی کبھی ایک ملاقات میں ایسے لگتا ہے کہ ہم کئی جنموں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ سروج شیشے کی طرح صاف اور پانی کی طرح نرمل ہے، میری شادی اسی سے ہوگی کوئی راضی ہو یا نہ ہو۔''

اپنا فیصلہ سنا کر رمیش گھر سے نکل گیا۔ ماں روتی چلاّتی رہ گئی۔ چھوٹے بہن بھائی اور باپ نے ماں کو سمجھانے کی پوری کوشش کر لی۔

''اگر تم نے ضد نہ چھوڑی تو تم اپنے بیٹے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی۔ اسی میں سب کی

بھلائی ہے کہ تم اس کی بات مان لو۔ اب چھوڑو پرانے زمانے کی باتیں۔ دُنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور تم وہیں ہو۔''

کئی روز کے بعد ماں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ''ٹھیک ہے، اسے شادی کرنی ہے تو کر لے مگر میری بھی ایک شرط ہے۔ اگر وہ مان لو تو میں راضی ہوں۔''

''وہ کیا ہے۔'' بیٹے نے ماں سے پوچھا۔

''میں اسی کو بتاؤں گی تو اسے لے کر آنا۔''

اگلے دن سروج کو لے کر رمیش گھر پہنچ گیا۔ اس لڑکی میں ایسی کشش تھی کہ سب کو اس نے ایک ہی ملاقات میں موہ لیا۔ ماں نے سر سے پاؤں تک اسے ایسے دیکھا جیسا جاننا چاہتی ہو کہ 'کیا خاص بات ہے تم میں' بات چیت کے دوران ماں نے شرط ظاہر کر دی۔

''شادی ایک شرط پر ہو سکتی ہے کہ تم شادی کے بعد پوری طرح سے اپنے مائکے سے رشتہ توڑ لو گی۔ نہ وہ یہاں آئیں گے نہ تم ان سے ملنے جاؤ گی۔''

''یہ کیسی شرط ہے ماں۔ سروج کی بات چھوڑو میں خود ایسی بات کے لیے راضی نہیں ہو سکتا۔'' رمیش کا چہرہ غصّے اور شرم سے لال ہو گیا۔

سروج ایسی شرط کے لیے کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی وہ پریشان کبھی ماں کا تو کبھی رمیش کا چہرہ تکتی رہی، ایک بھی لفظ اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔ ماں شرط چھوڑنے کو تیار نہیں تھی اور بیٹا ماننے کو راضی نہ تھا۔ دوسری طرف سروج نے شادی سے صاف انکار کر دیا۔

''میں تم سے دُور رہ کر خوش نہیں رہ پاؤں گی مگر میں تمھارے لیے اپنے گھر والوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔''

''میں نے تم سے کب کہا۔ میں تم سے، صرف تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہ سب بیکار باتیں بھول جاؤ۔ ہم تمھاری امی کو بلا لیتے ہیں اور ان کا آشیرواد لے کر شادی کر لیتے ہیں۔''

''نہیں رمیش یہ بھی ممکن نہیں۔ میں ایک بیٹے کو اس کے خاندان سے جدا کرنے کا پاپ اپنے سر نہیں لے سکتی۔ جس طرح میں اپنے پریوار سے الگ نہیں رہ سکتی اسی طرح تم کو بھی ان سے دُور نہ کروں گی۔ اگر شادی ہو گی تو سب کی رضامندی سے ورنہ نہیں ہو گی۔''

گھر جا کر اس نے سروج کا فیصلہ اپنے والد کو سنا دیا۔ ماں اور بابو جی کا دل پسیج اٹھا اور ایک ہفتے بعد دونوں کی شادی مندر میں کر دی گئی۔ نہ ان کی شادی میں ڈھول بجے نہ شہنائیاں،

نہ گیت گائے گئے، نہ کوئی شگن ہوا نہ اس کی آرتی اُتاری گئی۔ بس ایک رسم تھی شادی کی جو پوری کردی گئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب نے اسے قبول کرلیا۔ ماں نے دل سے اسے کبھی اپنی بہو نہیں مانا۔ ایک بار اس نے مائکے جانے کی ماں سے اجازت مانگی تو انھوں نے بہانہ بنا کر جانے سے منع کردیا۔ سروج سمجھ گئی لیکن اس نے ضد نہیں کی۔ رمیش نے لاکھ سمجھایا۔

''تم کو جب ماں اور بھائی سے ملنا ہو تو مجھ سے کہا کرو میں لے کر چلوں گا۔ صرف اطلاع کے لیے بتایا کرو اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔''

''ہم گھر میں رہتے ہیں اور وہ ہمارے بزرگ ہیں ہم ان کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔''

رمیش کے پیار نے اسے اتنا حوصلہ دیا کہ وہ ساس کی ہر زیادتی سہتی رہی۔ کچھ باتیں رمیش کو معلوم ہو جاتیں اور کچھ وہ اس سے چھپا جاتی۔ شروع شروع کے دنوں میں تو ساس کو اس کے ہاتھ سے بنا کھانا کھانے میں بھی اعتراض تھا۔ رمیش کے بابو جی نے محسوس کیا تو سمجھانا چاہا۔

''کیوں کرتی ہو تم ایسی باتیں۔ سروج تمھارے گھر کی بہو ہے، اب وہ اس گھر کا حصّہ ہے۔ تم اس طرح کا بھید بھاؤ مت رکھا کرو۔ اسے دُکھ ہوتا ہوگا۔''

''کیوں میرا دھرم خراب کر رہے ہو۔ جانتے ہو نا اس کے دادا موچی کا کام کرتے تھے۔'' اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم یہ کیوں نہیں دیکھتیں کہ وہ کس محنت سے اوپر اٹھے ہیں۔ تم اس کی خوبیاں کیوں نہیں دیکھتیں۔ اگر تم اپنی پسند کی لڑکی لاتیں تو شاید وہ بھی تمھاری زیادتی نہ سہتی مگر اس لڑکی کو دیکھو کبھی اُف تک نہیں کی۔ جانتی ہو کل تمھارا لاڈلا کہہ رہا تھا کہ الگ گھر لے کر رہتے ہیں۔ مگر اس نے صاف انکار کردیا۔ وقت کے ساتھ خود کو بدلو۔''

''مجھے اتنا بھاشن دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اچھا بُرا معلوم ہے۔'' یہ کہہ کر ماں وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی۔

وقت گزرتا گیا مگر سروج نے دوبارہ مائکے جانے کا نام نہیں لیا۔ ایک دو بار بھائی لینے بھی آیا پر اس نے جانے سے انکار کردیا۔ ماں سے بس فون پر بات ہو جاتی تھی۔ جب ماں کو معلوم ہوا کہ اس کی گود بھرنے والی ہے تو اس سے بنا ملے رہا نہیں گیا وہ خود ہی ملنے چلی آئی اور جلد اسے ساتھ لے جانے کو کہہ گئی۔ ساس بھی گھر میں بچہ دیکھنے کو اُتاولی تھی۔ سب خوش تھے اور اس

کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اب تو ساس بھی اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی تھی۔ سروج اسی میں خوش تھی کہ ماحول ٹھیک ہو رہا ہے اور شاید آنے والا اپنے ساتھ اتنی خوشیاں لائے کہ سب تلخیاں ختم ہو جائیں۔

جب ماں سروج کو زچگی کے لیے لینے آئی تو ساس نے صاف منع کر دیا:

''ہمارے یہاں پہلا بچّہ سسرال میں ہوتا ہے۔'' ماں اپنا سا منہ لے کر لوٹ گئی۔

کاجل کی پیدائش پر گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب سے زیادہ خوش کاجل کی دادی تھی۔ نانی نے خبر سنی تو بھاگی چلی آئی۔ ان کے گھر میں بھی تو یہ پہلا بچہ تھا۔ نانی اپنی حیثیت کے مطابق بہت سے تحفے لائی تھی۔ سب کو بدھائی دینے کے بعد اس نے بچی کو گود میں اٹھایا ہی تھا کہ دادی نے جھٹ سے بچّی واپس لے لی۔ ''ابھی اس کے سونے کا وقت ہے۔ سو کر اٹھے تو کھیل لینا۔ لاؤ مجھے دے دو میں سلا دیتی ہوں۔'' نانی دل مسوس کر رہ گئی۔ نواسی کو گود میں اچھی طرح کھلانے کی حسرت لیے نانی لوٹ گئی اور سروج ماں کا درد دیکھ کر دل ہی دل میں روتی رہ گئی۔

کاجل کی پیدائش کے بعد ذمہ داری بڑھ جانے کی وجہ سے وہ رمیش کے لیے بھی وقت نہ نکال پاتی۔ سارا دن گھر کے کاموں میں اور ساس سسر کی خدمت میں گزر جاتا۔ اس لیے جب دیور مہیش کی شادی پکّی ہوئی تو اسے بے حد خوشی ہوئی۔ ایک تو کوئی ہم عمر بات کرنے کو مل جائے گا اور دوسرے گھر کے کام کاج میں اس کی مدد ہو جائے گی۔ ساس اس لیے خوش تھی کہ بہو من پسند کی لا رہی تھی۔ 'اونچے خاندان کی خوبصورت پڑھی لکھی لڑکی۔' ماں کی خوشی دیکھ کر سب خوش تھے مگر رمیش سوچنے لگا کہ:

'کاش جس طرح ماں نئی دلہن کا استقبال کر رہی ہے اگر سروج کا بھی اسی طرح کیا ہوتا تو آج اس کے دل میں یہ ٹیس نہ اٹھتی۔ ماں نے میری بیوی کی قدر نہیں کی۔'

شادی دھوم دھام سے ہو گئی۔ سبھی رشتے دار اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ سب خوش تھے مگر سروج کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ اس نے ساس کو خوش کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ یہاں تک کہ اس نے غریب بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی کو پلٹ کر بھی نہ دیکھا مگر شادی میں ساس نے اسے بڑی بہو کا نہیں بلکہ گھر میں ایک خادمہ سے زیادہ رتبہ نہیں دیا۔ یہی ایک موقع تھا جب ساس سب رشتہ داروں کے سامنے اسے بڑی بہو کی عزّت دیتی تا کہ دوسرے بھی اس کا احترام کر سکتے۔

شادی کے بعد سروج نے خود کو کاجل میں زیادہ مصروف کرلیا اور گھر کے کاموں سے ہاتھ کھینچ کر پتی کے لیے بھی وقت نکالنے لگی۔ ساس کو تو نئی بہو کا نشہ تھا اور اسی موقع کا فائدہ اٹھا کر اس نے قدم پیچھے کھینچ لیے۔ پہلے ہر کام کے لیے ''سروج سروج'' پکارا جاتا تھا اور اب ساس ''رادھا بہورانی'' پکارنے لگی۔ شروع کے دو مہینے تو رادھا بھی کام بھاگ بھاگ کر کرتی رہی مگر بناوٹی رنگ زیادہ دن ٹک نہ سکا۔

''رادھا بہورانی۔ آ کر مجھے دوا تو دینا۔''

دوسرے کمرے سے آواز آئی ''میں کام کر رہی ہوں خود اُٹھ کر لے لو۔''

سروج ادھر سے بچّی کے لیے دودھ لے کر گزر رہی تھی دونوں کی باتیں کان میں پڑ گئیں۔ رادھا کے کمرے میں دیکھا تو وہ آئینے کے سامنے تیار ہو رہی تھی اور دوسرے کمرے میں ساس بستر سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کمرے میں گئی اور ساس کو پانی کا گلاس اور دوا تھما کر باہر چلی گئی۔ ساس منہ دیکھتی رہ گئی۔

رادھا رئیس باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ بڑے لاڈ پیار سے ماں باپ نے پالا تھا۔ گھر میں نوکر چاکر تھے اس لیے کام کرنے کی عادت نہ تھی، ساس نے بھی دلار میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ ویسے تو اس گھر میں بھی پیسے کی کمی نہ تھی مگر ان لوگوں نے اور گھر بھر دیا تھا۔ سروج نے سوچا تھا کہ دیورانی آئے گی تو کوئی ہاتھ بٹانے والا مل جائے گا، دکھ سکھ بانٹنے والا مل جائے گا مگر ساس نے نہ تو لاڈلی بہو کو کام کرنے دیا اور نہ دونوں میں میل جول ہونے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی بڑی جیٹھانی کی پوری عزت نہ کر سکی۔

ایک روز شام کے وقت وہ اپنے کمرے میں کچھ کام کر رہی تھی کہ ساس نے آ کر پوچھا۔

''رادھا بتا کر گئی ہے کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟''

''جی نہیں۔''

''معلوم نہیں کہاں چلی گئی۔ کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں گئی۔'' منہ میں بڑبڑاتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ مہیش دفتر سے لوٹا تو ماں نے پریشانی ظاہر کر دی۔

''دو تین گھنٹے ہو گئے رادھا نہ جانے کہاں چلی گئی۔ کچھ بتا کر بھی نہیں گئی۔''

''فکر نہ کرو ماں وہ اپنی سہیلی کے گھر گئی ہے۔ مجھے فون پر بتا دیا تھا۔''

''تمھیں فون پر بتا دیا تھا؟ ہمیں بنا بتائے کیسے چلی گئی؟''

''تو کیا ہوا مجھے تو معلوم ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ماں سوچتی رہ گئی۔ سروج تو کبھی بنا بتائے کہیں جاتی نہیں اور میری لاڈلی بہو نے مجھے بتانا مناسب نہ سمجھا؟

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ اس کی پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔ انھوں نے اندر باہر چہل قدمی شروع کر دی۔ جیسے ہی بہو گھر میں داخل ہوئی ساس نے گھیر لیا۔

''کہاں گئی تھی بنا بتائے بہو؟'' غصّہ دباتے ہوئے ساس نے پوچھا۔

''مہیش کو بتا کر گئی تھی اور اپنی سہیلی کے یہاں گئی تھی۔''

''کیا ہم گھر پر نہیں تھے۔''

''تھے۔''

''تو کیا تمھارا فرض نہیں بنتا تھا کہ ہم سے اجازت لے کر جاتیں؟''

''اجازت؟ میں کوئی دُودھ پیتی بچّی نہیں ہوں جو اجازت لے کر جاؤں۔ اطلاع کے لیے میں نے مہیش کو بتا دیا تھا۔'' اس کی آواز میں بھی تلخی تھی۔

''مگر یہ سب یہاں نہیں چلے گا، تمھیں اپنے طور طریقے بدلنے ہوں گے۔'' ساس نے اصلی تیور دکھاتے ہوئے کہا۔ لڑائی کا شور سن کر سروج اور بابو جی بھی کمرے میں آ گئے۔ سب کے سامنے بے عزّتی ہوتے دیکھ بہو بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔

''مجھے اونچی آواز سننے کی عادت نہیں ہے۔ آئندہ میرے ساتھ اس لہجے میں بات نہ کریں تو اچھّا ہے۔ میں جیسی ہوں ویسی رہوں گی، اگر آپ کو پسند نہیں تو ہم گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' بالوں کو جھٹکا دیتی ہوئی بنا کسی کی پروا کیے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ ساس ہکّا بکّا رہ گئی اور جیسے ہی اس کی نظریں سروج سے ملیں، خود بخود جھک گئیں۔ وہ ان آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

'اُونچے خاندان کی پڑھی لکھی......'

OO

محافظ

آج پھر چالیس برس بعد تاریخ دوہرائی جا رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس بیمار غریب بیوہ کی جگہ اس وقت اس کے بیمار ابوّ تھے جن کے پاس بے شمار دولت تھی اور ان کی موت کے بعد سبھی رشتے دار ان کی بچی کو گود لینے کو تیاّر تھے۔ اور اس وقت اس غریب بیوہ کی چاندنی کا مستقبل اندھیرے میں ڈوب رہا تھا۔

''آپ نے کیا فیصلہ کیا میری چاندنی کے بارے میں بی بی جی؟'' شانتابائی نے ساڑی کے پلّو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''تم فکر مت کرو۔ میں نے 'ہمارا گھر' والوں سے بات کر لی ہے۔ وہ اسے لینے کو راضی ہیں۔'' اس نے آنکھیں چُراتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر 'ہمارا گھر' تو یتیم خانہ ہے۔ نہ بی بی جی میں اپنی بچّی کو یتیم خانے میں ہرگز نہیں بھیجوں گی'' وہ پھر سے رونے لگی۔

آنے والے طوفان سے بے خبر معصوم چاندنی ایک کونے میں کھیل رہی تھی، اس بات سے انجان کہ کچھ روز میں وہ اتنی بڑی بے رحم دُنیا میں بالکل تنہا ہو جائے گی۔ باپ پیدائش سے پہلے ہی سڑک حادثے میں چل بسا اور ماں لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ جس روز سے شانتا بائی کو اپنی بیماری کی خبر ہوئی تھی اسی دن سے وہ بچّی کے مستقبل کو لے کر پریشان تھی۔ ماں کے رونے کی آواز سن کر وہ بھی زور زور سے رونے لگی۔ شانتابائی نے لپک کر اسے سینے سے ایسے چپکا لیا جیسے جیتے جی اس کو خود سے ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں کرے گی۔

''میں تو سمجھتی تھی کہ آپ چاندنی کو بہت پیار کرتی ہیں۔ اُسے آپ کے حوالے کر دیتی تو چین سے مر سکتی تھی۔ آپ اُسے سہارا دیں گی تو بڑی ہو کر میری طرح یہ بھی آپ کی خدمت کرے گی۔ ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ جو بچے گا اسے کھانے کو دے دینا۔''

''شانتابائی! اس طرح میرے آگے ہاتھ مت جوڑو۔ وہاں اُسے کئی ساتھی مل جائیں

گے اور پھر میں اُس سے ملتی رہوں گی۔ میرے پاس تنہائی کے سوا کیا ہے۔ میں اکیلی جان اس بچی کو کیسے سنبھال پاؤں گی۔ اور اگر کل کو مجھے کچھ ہو گیا تو اس کا خیال کون رکھے گا۔'' اُس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ رہنے دو بی بی جی۔ میں کسی بھی قیمت پر اِسے اناتھ آشرم نہیں بھیجوں گی۔'' ناراضگی سے وہ اُٹھی اور بچی کو گود میں لیے چلی گئی۔

اگلے پانچ روز اُس نے صورت نہیں دکھائی۔ پھر ایک شام بچّی کو گود میں لیے آ گئی، یہ بتانے کے لیے کہ اس کا دُور دراز کا ایک رشتے دار گاؤں سے بچّی کو لے جانے آ رہا ہے۔ جو تھوڑا بہت اُس نے جمع کیا تھا اور گاؤں کی جو تھوڑی سی اُس کے حصّے کی زمین تھی وہ سب اُس نے ان لوگوں کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''تم تو کہتی تھیں کہ تمھارے گاؤں میں کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ غریبی اتنی ہے کہ لوگ روٹی کی خاطر اپنی بیٹیوں کو بھی بیچ دیتے ہیں پھر بھی تم چاندنی کو ایسے لوگوں کے حوالے کر رہی ہو۔ میرا کہا مانو تو اسے 'ہمارا گھر' میں بھیج دو۔'' مگر وہ کوئی بھی بات سننے اور سمجھنے کو تیار نہ تھی۔

''نہیں بی بی جی میں انجان لوگوں کے حوالے اپنی بیٹی نہیں کر سکتی۔ اپنے چچیرے بھائی کے حوالے کر دوں گی وہاں اپنوں میں یہ محفوظ تو رہے گی۔''

''محفوظ'' لفظ اس کے کانوں میں سیسے کی طرح پگھل گیا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ کبھی کبھی محافظ بھی لٹیرے بن جاتے ہیں۔ بے رحم انسان رشتہ نہیں دیکھتے۔ جن کی آنکھوں میں، دل میں پیسے کی یا جسم کی ہوس پنپتی ہے وہ عمر بھی نہیں دیکھتے۔ وہ حیوان بن جاتے ہیں۔ اس کے پاپا کے چچازاد بھائی کا بھی ضمیر مر گیا تھا جس کے حوالے کر کے اس کے پاپا نے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں۔ اسی محافظ نے تیرہ برس کی ننھی کلی کو نوچ کر زخمی کر دیا تھا اور آج وہ مرجھایا ہوا پھول اس دُنیا میں بالکل تنہا تھا جسے کسی بھی رشتے پر یقین کرنے سے ڈر لگتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے وہ کسی سے بھی محبت کا رشتہ قائم نہ کر سکی تھی۔ دوسرے ہی پل چاندنی کا خیال آتے ہی وہ لرز اُٹھی۔

کیا وہ اتنی سنگ دل ہو گئی ہے کہ ایک ننھی سی کلی کو زمانے کی تیز ہواؤں میں جھلنے کے لیے چھوڑ دے گی۔ شاید اس کا ضمیر ابھی زندہ تھا اسی لیے اس نے ننھی چاندنی کو گود میں لے کر کہا ''شانتا بائی یہ اب کہیں نہیں جائے گی۔ یہیں رہے گی میرے پاس۔''

OO

دہشت گرد

پچھلے ایک ہفتے سے جیوتی اپنے شوہر وشال سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہر بار ناکامی اُس کے ہاتھ لگتی۔ ابھی تین مہینے پہلے وشال کا تبادلہ بمبئی ہوا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ وشال کے ساتھ نہ جا سکی۔ ایک سال پہلے ہی تو اُس نے بنا تنخواہ کے لمبی چھٹی لی تھی اور اب پھر سے لمبی چھٹی ملنی ممکن نہ تھی۔ وشال کے بنا گھر اُسے کاٹنے آتا تھا۔ سُونا آنگن، ویران درو دیوار کی وہ عادی ہو چکی تھی مگر تقدیر کے آگے کس کی چلی ہے، اسے پہلے سے ان سب کی عادت نہ تھی۔ کبھی اُس کا گھر بھی بچوں کی شرارتوں اور شور و غل سے مہکتا تھا۔ مگر حالات نے مجبور کر دیا اس ویرانی میں گھٹ گھٹ کر جینے کے لیے......

اخبار کی سرخیوں میں آج پھر یہ خبر چھپی تھی کہ دہشت گردوں کی گولیوں سے دس افراد ہلاک ہوئے اور پندرہ زخمی جن میں چھ عورتیں اور باقی بچے ہیں۔ خبر پڑھتے ہی اُس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی اور دل ڈوبنے لگا۔ خبر کا ایک ایک لفظ اُس کے دل پر نشتر چبھا رہا تھا۔ یہ بے حس دہشت گرد تو اپنا کام کر کے آگے نکل جاتے ہیں اور اپنی بے رحمی کے نقش ہمیشہ کے لیے ان لوگوں کے دل و دماغ پر چھوڑ جاتے ہیں جو آدھے ادھورے زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ ایک آدمی کو نہیں بلکہ اُس سے وابستہ کئی دوسرے لوگوں کو بھی جیتے جی مار جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ ایک مرنے والے کے ساتھ کتنے لوگ مر گئے۔ اس وقت اُسے وشال کی کمی شدّت سے محسوس ہوئی۔ اُسے ان کمزور لمحوں میں اُس کے سہارے کی بے حد ضرورت تھی۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے اور نہ چاہتے ہوئے بھی پھر سے اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ دردناک منظر گھومنے لگا۔

جیوتی اور وشال اپنے دونوں بچوں، ممتا اور وکرم کے ساتھ جالندھر سے ڈلہوزی چھٹیاں بتانے بس سے سفر کر رہے تھے۔ بچے پہاڑوں پر چھٹیاں بتانے کے تصوّر سے ہی بہت خوش

تھے۔بس میں بھی اُن کی شرارتیں جاری تھیں۔جیوتی اُن کی مستیاں دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہورہی تھی اور وشال کو بھی کتاب چھوڑ کر ان کی شرارتوں سے لطف اٹھانے کو کہہ رہی تھی۔ اچانک ایک زوردار دھما کا ہوا اور چاروں طرف کالا دُھواں چھا گیا۔فضا میں چیخ و پکار سُنائی دینے لگی اس کے بعد اُسے کچھ ہوش نہ رہا۔جیوتی کو ہوش آیا تو خود کو اُس نے اسپتال میں پایا۔

ہوش میں آتے ہی سب سے پہلے اُسے بچوّں اور وشال کا خیال آیا۔خود کو کہاں کہاں چوٹ لگی ہے اس بات کی پروا کیے بغیر وہ دوسرے مریضوں میں انھیں تلاش کرنے لگی۔چاروں طرف تہلکہ مچا ہوا تھا۔درد سے مریضوں کے چیخنے کی آوازیں، بچوّں کے رونے کا شور تو کسی کے ماتم کی سسکیوں نے پورے عالم کو دردناک بنا دیا تھا۔ ہرطرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ اچانک اُس کی نظر وشال پر پڑ گئی۔جو زخمی حالت میں بے سدھ کونے والے بستر پر پڑا ہوا تھا۔ اور ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب ان کو کیا ہوا ہے؟ کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟ کب تک ٹھیک ہوجائیں گے؟''اُس نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔

''سر پر چوٹ لگی ہے جو جلدی ٹھیک ہوجائے گی مگر ٹانگ کی جو ہڈّی ٹوٹی ہے اُسے ٹھیک ہونے میں البتہ وقت لگے گا۔گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب میرے بچےّ بھی ساتھ تھے جو مجھے کہیں نظر نہیں آرہے۔ان کے بارے میں کس سے معلوم کروں؟''

''آپ اُدھر وارڈ میں بھی دیکھ لیں اگر پتہ نہیں چلتا تو اُس طرف کونے میں ایک کاؤنٹر بنا ہے وہاں سے معلوم ہوجائے گا۔''

ڈاکٹر کے جاتے ہی اُس نے پھر تلاش شروع کردی۔لیکن بچوں کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔تھکی ہاری وہ پوچھ تاچھ والے کاؤنٹر پر پہنچی تو وہ اُسے **Mortuary** کی طرف لے گئے۔

''چند بچوں کی لاشیں یہاں پڑی ہیں جن کی شناخت نہیں ہوسکی آپ ان میں سے دیکھ لیں۔''

یہ سنتے ہی جیوتی کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ بوجھل قدموں سے اپنے جسم کا بوجھ اُٹھائے وہ اندر داخل ہوگئی۔ دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے سینے سے نکل کر باہر

آ جائے گا۔ جیسے جیسے کفن سرکتے جاتے اُس کی سانس رُکتی جاتی۔ آخر دہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے جگر کے ٹکڑوں کی لاشیں بُری طرح سے جھلسی ہوئی حالت میں لاوارث لاشوں کے ساتھ پڑی تھیں۔ دل کی دھڑکن بند ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اُسے لگا جیسے ساری کائنات گھوم گئی ہو۔ اس کے حلق سے ایک زوردار چیخ نکلی اور وہ غش کھا کر زمین پر گر گئی۔ جو لوگ اُس وقت اُس کے ساتھ تھے وہ اُسے اٹھا کر باہر لائے۔ جب ہوش آیا تو بچوں کے آخری سفر کی سب تیاریاں ہو چکی تھیں۔ وشال چلنے پھرنے سے لاچار بستر پر تڑپتا رہا۔ جیوتی بے جان بے سدھ جیسے جیسے لوگ کہتے گئے کرتی گئی۔ ایک زندہ لاش کی طرح اپنے دونوں بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے رخصت ہوتے دیکھتی رہی اور پھر تھک ہار کر اپنا سب کچھ لٹا کر واپس وشال کے پاس لوٹ آئی۔

ایک مہینے کے بعد وشال بیساکھیوں کے سہارے چلنے پھرنے لگا۔ اس ایک مہینے میں جیوتی نے وشال کی اتنی خدمت کی کہ اُسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ چل پھر نہیں سکتا اور لاچار ہے۔ اُس نے بچوں کی موت کا صدمہ اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا کہ کہیں اس کے آنسو دیکھ کر وشال کی تکلیف اور نہ بڑھ جائے۔ اُسے اس طرح سارا سارا دن اپنی خدمت کرتے دیکھ کر وشال سوچنے لگتا کہ نہ جانے کیوں کہا جاتا ہے کہ عورت صنفِ نازک ہے۔ وہ تو مرد سے بھی زیادہ مضبوط ہے جو خود بھی نہیں ٹوٹتی اور مرد کو بکھرنے سے بھی بچا لیتی ہے۔

جس روز وشال نے دفتر جانا شروع کیا اُس کے اگلے روز ہی اُس نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا۔ بچّوں کے ساتھ اسکول میں غم کچھ کم ہو جاتا۔ دن بھر کے تھکے ماندے جب دونوں گھر لوٹتے تو اُن کو گھر کاٹنے کو آتا۔ بچّوں کی شرارتیں، ان کے قہقہے، اُن کی پیاری پیاری باتیں دونوں کو بے چین کر دیتیں۔ وہ اُن کی چیزوں کو، اُن کی تصویروں کو کبھی چومنے لگتے تو کبھی سینے سے لگا کر ایک دوسرے سے آنکھ بچا کر رونے لگتے۔ اپنا غم دوسرے پر ظاہر نہ ہونے دیتے۔ جس گھر میں بچوں کی ہنسی گونجا کرتی تھی وہاں اب صرف موت کا سناٹا تھا اور اُس سناٹے میں کبھی کبھی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

بچّوں کے گھر سے جاتے ہی ایسا لگتا تھا کہ جیسے اُن دونوں کو جوڑنے والی جو ایک کڑی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ وشال سمجھتا تھا کہ جیوتی بہت ہمّت والی ہے لیکن یہ ہمّت، یہ مضبوطی دراصل اُس کی کمزوری تھی۔ وہ ٹوٹ چکی تھی، مگر بکھرنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے وشال کے سہارے کی ضرورت

تھی مگر وشال یہ سوچتا رہا کہ وہ اس صدمے کو سہہ چکی ہے۔

ایک شام دفتر سے لوٹ کر چائے پیتے ہوئے وشال نے بتایا:

''شاید میرا تبادلہ بمبئی ہو رہا ہے۔''

''کیا؟ یہ نہیں ہوسکتا۔ کسی بھی طرح تم اُسے رکوالو۔''

''میں کوشش کروں گا۔ مگر مجھے مشکل لگتا ہے۔''

''وشال مجھے تو اسکول سے چھٹّی بھی نہیں ملے گی اور تم جانتے ہو میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ تم اپنے دفتر والوں کو اپنی مجبوری سے آگاہ کرو۔ لکھ کر دے دو یا سفارش کرواؤ مگر کسی بھی طرح اس تبادلے کو رُکوالو۔''

جواب میں وشال نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

تبادلہ نہ رُکنا تھا اور نہ رُکا۔ جیوتی سے جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے وہ بمبئی کے لیے روانہ ہوگیا۔ جیوتی اکیلی رہ گئی۔ حالات سے سمجھوتہ کرنا پڑا، اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

دن تو جیوتی کا اسکول میں بچوں کے ساتھ کٹ جاتا مگر شام کو گھر لوٹتے ہی اُسے تنہائی ڈسنے لگتی۔ بچوّں کا غم اور وشال کی جدائی اُسے رات بھر ستاتے اور رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جاتی۔ چین کی نیند سوئے تو شاید اُسے زمانے بیت گئے تھے۔ شروع شروع میں ہر دوسرے روز وشال کا فون آجاتا لیکن آہستہ آہستہ ہفتے میں ایک بار اور پھر مہینے میں ایک بار ہوگیا۔ اس بار تو مہینے سے اُوپر ہوگیا مگر اس کا کوئی فون نہیں آیا۔ گھنٹوں وہ فون کے پاس بیٹھی رہتی مگر صرف مایوسی اُس کے ہاتھ لگتی۔ دن گزرتے جارہے تھے اور اُس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ طرح طرح کے خیال اُسے پریشان کر جاتے۔ انجان شہر، انجان لوگوں کے بیچ وشال تنہا ہے، وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔ یا پھر بیمار نہ پڑ گیا ہو۔ وہاں تو کوئی اُس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں۔ جب پچھلی بار دیر سے فون کرنے پر اُس نے گلہ کیا تھا تو وہ بھڑک اُٹھا تھا۔

''وشال اتنے دنوں بعد فون کرتے ہو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔''

''کئی بار لائن نہیں ملتی بس اسی لیے دن لگ جاتے ہیں۔ اور رات دیر سے میں فون کر کے تمھیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔''

''تم فون نہیں کرتے ہو تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔ تم وقت مت دیکھا کرو بس فون

کر دیا کرو مجھے تسلّی ہو جاتی ہے۔ تم گھر پر فون کب لگوا رہے ہو۔''

''ابھی کچھ معلوم نہیں، ابھی تو میں کوئی اچھّا سا گھر تلاش کر رہا ہوں۔''

''تو پھر دفتر کا فون نمبر دے دو، میں وہیں فون کر لیا کروں گی۔''

''تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ دفتر میں فون کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے جب وقت ملے گا میں خود کر لیا کروں گا۔''

اور اُس دن کے بعد فون آیا ہی نہیں۔ دل ہی دل میں اُس نے فیصلہ کر لیا کہ جیسے بھی ہو وہ اسکول سے چھٹی لے لے گی اور ٹکٹ ملتے ہی بمبئی کے لیے روانہ ہو جائے گی۔ زندگی کا سکون اور وشال کا پیار اس کے لیے زیادہ اہم ہے نوکری ان سب کے آگے کچھ بھی نہیں۔ اپنے اس فیصلے سے اُسے کافی راحت ملی اور بہت دنوں بعد وہ سکون کی نیند سوئی۔

چھٹّی منظور ہو کر بھی نہیں آئی تھی کہ اُس نے ٹکٹ بک کروالی۔ بس صرف پانچ دن کی تو بات ہے اس کے بعد وہ اپنے وشال کے پاس ہو گی۔ اتنے دن تو تیّاریوں میں ہی گزر جاتے ہیں۔ جب وہ پاس تھا تو اکثر چھوٹی چھوٹی بات پر اُس سے جھگڑا ہوا کرتا تھا۔ مگر اس جدائی نے اُس کے پیار کو دوبالا کر دیا۔ دُوری سے دل میں جو کسک پیدا ہوئی تھی اُس نے یہ احساس دلا دیا تھا کہ اُس کا دل ابھی بھی زندہ ہے جسے وہ کب کا مرا ہوا سمجھ رہی تھی۔ اب وہ صرف پیار کرے گی، کبھی جھگڑا نہیں کرے گی۔ اُسے کسی بات کے لیے پریشان نہیں کرے گی۔ اُس کی زندگی میں وشال کے علاوہ اور رکھا ہی کیا ہے۔ انھیں خیالوں میں مصروف وہ جانے کی تیاریاں کر رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو ڈاکیا اُس کے نام کی رجسٹری لے کر آیا تھا۔ اپنے نام کا رجسٹرڈ خط دیکھ کر اُسے تعجب ہوا۔ خط وشال نے بھیجا تھا۔ سب کام چھوڑ کر وہ خط پڑھنے لگی۔

''جیوتی!

مجھے معلوم ہے تم میرے لیے پریشان ہو رہی ہو گی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دراصل کچھ باتیں ایسی ہیں جو میں تم سے رُوبرو نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی فون پر، اس لیے مجھے خط کا سہارا لینا پڑا۔ تم تو جانتی ہو مجھے بچّے کتنے پیارے لگتے ہیں۔ تمھیں یاد ہو گا جب ہماری شادی ہوئی تھی تو ایک روز میں نے تم سے کہا تھا۔

'جیوتی۔ میں نے کل رات خواب میں دیکھا کہ ہمارے یہاں چار پانچ ایک ہی عمر کے

بچے خوب شور مچا رہے ہیں۔ میں اُن میں گھرا ہوا ہوں اور تم ہم کو ڈانٹ رہی ہو'اس کا کیا مطلب ہوا؟'

'اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں ایک اسکول میں اُستانی ہوں اور آپ چھوٹے بچّوں کے ساتھ پڑھتے ہو۔'

'دھت تیرے کی۔ اسکول کہاں سے آ گیا۔ وہ تو گھر تھا۔ وہ سب بچّے ہمارے تھے۔'

'سب؟'

'ہاں! یہ خواب تو میں جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھتا ہوں۔ کب پورا کروگی میرا یہ سپنا؟' میری آنکھوں کی شرارت دیکھ کر تم شرما گئی تھیں۔

'ایک دو بچے تو ٹھیک ہیں مگر چار پانچ بچّے!...... آج کے زمانے میں اتنے بچّوں کی پرورش کتنی مشکل ہے۔ پھر پیدا کون کرے گا اتنے بچّے؟'

'تم اور کون؟'

'باپ رے باپ میں تو ابھی ایک کے لیے بھی تیار نہیں۔ کم از کم ابھی دو سال انتظار کرو پھر بچّے کی بات کرنا۔'

'دو سال؟ میں تو نو مہینے کا انتظار بھی نہیں کر سکتا۔ میرا بس چلے تو ہر بار دو دو بچّے ہونے چاہئیں۔'

اتنا کہہ کر میں نے تمھاری ایک نہ سُنی اور تمھیں باہوں میں بھر لیا۔

جیت میری ہی ہوئی ایک سال کے اندر اندر ممتا تمھاری گود میں تھی جس نے ہماری زندگی میں چار چاند لگا دِیے تھے۔

'جیوتی! کتنا پیارا تحفہ دیا ہے تم نے مجھے۔ میں اس کے لیے تمھارا قرض دار ہوں۔ اب جلدی سے ایک بیٹے کی بھی تیاری کر لو۔'

'کیا کہا؟ شرم نہیں آتی تمھیں ابھی جی بھر کے گود میں بیٹی کو اُٹھایا بھی نہیں اور تم بیٹے کی بات کرتے ہو۔ تم نے ڈانٹ کر کہا تھا۔'

'ایک بیٹا تو چاہیے۔' میں نے منّت کی۔

'اگر بیٹا چاہیے تو کہیں سے گود لے لیتے ہیں۔ مجھ میں اب اور بچّہ پیدا کرنے کی ہمّت نہیں۔'

'آج تم نے یہ بات کہہ دی۔ آئندہ ایسی بات مذاق میں بھی مت کرنا۔ اگر میرے یہاں اولاد نہ بھی ہوتی تو بھی میں کبھی بچّہ باہر سے نہیں لیتا۔' اور میں غصّے سے اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

بہت اچھے دن تھے وہ۔ نہ جانے کس کی نظر لگ گئی اور سب تباہ ہو گیا۔ اب تو چاہ کر بھی وہ دن لوٹ کر نہیں آسکتے۔ میں نے چاہا تھا کہ اب بچّوں کے جانے کے بعد نئے سرے سے زندگی شروع کریں گے، مگر یہ شاید بھگوان کو منظور نہ تھا۔

اس انجان شہر میں جہاں کسی کو کسی کا حال جاننے کی فرصت نہیں۔ وہاں میری ملاقات ایک ہمدرد سے ہوئی۔ جس کی رفاقت نے میری زندگی میں چھائے غم کے بادلوں کو کچھ حد تک کم کر دیا ہے۔ اب پھر سے جینے کی تمنا ہو رہی ہے۔

مجھے معاف کرنا میں یہ جانتا ہوں۔ میں تمھارے ساتھ انصاف نہیں کر رہا مگر کیا کروں انسان ہوں۔ شاید اسی لیے خود غرض بھی ہوں۔ مجھے بھی تو اپنی زندگی کے بارے میں، اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کا پورا حق ہے۔

آج سوچتا ہوں تو تمھارے اُس فیصلے پر افسوس ہوتا ہے۔ وکرم کی پیدائش کے بعد آپریشن کرانے کا تمھارا فیصلہ کتنا غلط تھا۔ اگر تم آپریشن نہ کراتیں تو آج تمھیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ تم دوبارہ ماں نہیں بن سکتیں لیکن میں تو باپ بن سکتا ہوں۔''

OO

قبضہ

ابھی نیند کا پہلا جھونکا آیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک سن کر وہ ہڑبڑا کر گرم گرم بستر چھوڑنے پر مجبور ہوگیا۔ لائٹ جلا کر دیکھا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اتنی رات کو اس سردی میں کون ہوسکتا ہے؟ یہ سوچتے ہوئے راج کمار نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے بوڑھی مکان مالکن کھڑی تھی۔

''مائی آپ اس وقت اور اکیلے؟'' اس نے دوبارہ آنکھیں مل کر دیکھا۔

''اب اندر آنے بھی دے گا یا باہر سے ہی باتیں کرتا رہے گا۔''

راج کمار پیچھے ہٹ گیا اور مائی ڈیوڑھی پار کر کے آنگن سے ہوتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئی۔

پرانے شہر کے بازار کے بیچوں بیچ پہلی گلی کے مڑتے ہی دائیں اور بائیں طرف تین تین مکان اور بیچ گلی کے بالکل سامنے اس بیوہ کا مکان جسے لوگ پیار سے مائی کہہ کر پکارتے تھے۔ تقسیم ملک کے وقت، جب وہ ایک بھری پوری حویلی چھوڑ کر دنگوں میں اپنے چار چار بچوں کو بچاتی ہوئی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اس شہر میں آئی۔ اس وقت بھی وہ بیوہ تھی۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات نے اس کی مانگ سونی کردی۔ اس کے ننھے منّے بچے یتیم ہوگئے۔ اس وقت اس کی عمر کوئی تیس سال کی رہی ہوگی۔ اتنی خوبصورت کہ ہاتھ لگا دو تو میلی ہو جائے۔ چاندی جیسا دمکتا ہوا رنگ، نیلی گہری آنکھیں اور چھریرا بدن۔ کوئی دیکھے تو سمجھے کہ کوئی کنواری جا رہی ہے۔ بیوہ ہونے کے بعد اس نے سفید رنگ کے علاوہ دوسرا کوئی رنگ نہیں پہنا۔ سفید لباس اس کے رنگ و روپ کو اور نکھار دیتا۔ سر ہمیشہ دوپٹّے سے ڈھکا ہوتا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اتنی خوبصورت ہونے کے باوجود بھی کسی کی ہمّت نہیں ہوتی تھی کہ اس پر بُری نظر ڈالے۔ اتنی پاک اور نیک عورت کہ لوگ دل سے اس کا احترام کرتے تھے۔ یہ مکان اسے سرکار کی طرف سے معاوضے

میں ملا تھا۔ گھر میں جو آنگن تھا اس کے تین طرف کمرے تھے اور ایک طرف سیڑھیاں تھیں جو چھت پر جاتی تھی۔ بچوں کی شرارتوں سے یہ آنگن مہکتا تھا۔ اس آنگن میں اس کے بچّے کھیل کر جوان ہوئے اور وہ بوڑھی۔ وقت کے ساتھ بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئیں، اور بیٹا نوکری کے سلسلے میں دلّی جا بسا، اور یہ آنگن ویران ہو گیا۔ بیٹے نے گھر بسانے کے بعد بھی ماں کی بہت خوشامد کی۔ مگر اس نے اپنا گھر چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ جب دل زیادہ اُداس ہو جاتا تو وہ بچوں سے ملنے دلّی چلی جاتی، مگر جلد ہی لوٹ آتی۔ اس گھر کے در و دیوار سے اسے بے حد لگاؤ تھا۔ اس نے اس گھر کی تعمیر میں اپنے ہاتھوں سے اینٹ پتھر، ملبہ اٹھائے تھے۔ جب اس کی صحت بگڑنے لگی تو بیٹا ضد کر کے اپنے ساتھ لے گیا اور جانے سے پہلے اپنے ایک دوست کو مکان کرائے پر دے دیا۔ جب کبھی مائی کو گھر کی یاد ستاتی تو وہ وہاں چلی آتی۔ راجکمار اور اس کی بیوی اسے الگ سے کھانا نہیں بنانے دیتے تھے۔

''مائی آپ تو ہماری بزرگ ہیں۔ ہمارے ہوتے آپ اپنا کھانا نہیں بنائیں گی۔'' اور راج رانی انھیں پکڑ کر بستر پر بٹھا دیتی۔

''آپ تو بس اسی طرح جچتی ہیں۔''

کرایہ تو نا کے برابر ہی تھا۔ جو کرایہ آتا وہ گھر کی مرمت پر ہی لگ جاتا۔ مائی کو تو بس اس بات کی تسلّی تھی کہ اس کے آنگن میں رونق ہے۔ راجکمار اور راج رانی اسے گھر کے بزرگ کی عزت دیتے اور وہ بھی انھیں اپنے مہندر اور بہو سے کم نہ سمجھتی۔

''مائی آپ اس وقت اکیلی کیسے آ گئیں؟'' راج رانی نے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔

''اس وقت کیا ہوا ہے؟ اپنے گھر تو میں کسی بھی وقت آ سکتی ہوں، اور پھر مجھ اکیلی کا کیا ہے۔ ساری عمر اکیلی ہی تو رہی ہوں۔''

''میرا مطلب اتنی سردی میں اتنا لمبا سفر اور وہ بھی اکیلے جبکہ آپ کی طبیعت ٹھیک بھی نہیں رہتی۔ مہندر بھائی صاحب نے آپ کو اکیلے کیسے بھیج دیا۔''

''میں نے سنا ہے تم نے جو مکان بنانا شروع کیا تھا وہ مکمل ہو گیا ہے۔ اور تم لوگ وہاں جا رہے ہو۔ میں نے سوچا میں بھی تو تمھارا گھر دیکھ لوں۔''

دونوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''کب لے جاؤ گے مجھے اپنا نیا گھر دِکھانے؟''

''صبح ہی لے جاؤں گا۔رات کافی ہوگئی ہے اب آپ کچھ کھاپی کر آرام کریے۔''

''کھانا تو میں کھا آئی بس آرام کروں گی۔''

جیسے ہی وہ بتی بجھا کر نکلنے لگی۔ مائی نے آواز دے کر روک لیا۔''کیا بات کمرے میں میرا سامان نظر نہیں آرہا؟''

''وہ کمرے کی صفائی کروائی تھی تو دوسرے کمرے میں پڑا ہے آپ کا سامان۔''

''اچھا بتی بجھا دو۔''

بتی بجھا کر دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔نیند دونوں کی آنکھوں سے غائب ہو چکی تھی۔

''کس نے خبر کر دی اس بڑھیا کو کہ مکان تیار ہو گیا ہے۔''

''مجھے کیا معلوم؟ اب کیا ہوگا؟''

''سب سے پہلے تو اُٹھ کر اس کا سامان جو باہر پھینکا ہے اس کو دوسرے کمرے میں رکھ لو۔اگر اس نے سامان اس طرح باہر پڑا ہوا دیکھ لیا تو مصیبت ہو جائے گی۔''

''ابھی بڑھیا سو جائے تو سامان مل کر اندر رکھ دیتے ہیں۔''

دونوں خاموش اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہے۔پھر راج رانی نے خاموشی توڑی۔

''آپ نے ایک بات پر غور کیا؟''

''کیا؟''

''بڑھیا تو اور تندرست ہوگئی ہے۔ایسا لگتا ہے وہ دس سال پہلے والی مائی ہو۔کتنا نور ہے چہرے پر۔چال میں بھی پھرتی ہے۔پچھلی بار جب آئی تھی تو کیسے رُک رُک کر چلتی تھی لمبے لمبے سانس لیتی تھی اور کمزور اتنی کہ اب گئی کہ گئی۔''

''وہ حالت دیکھ کر ہی تو سوچتا تھا کہ بڑھیا تھوڑے دن کی مہمان ہے۔اپنا مکان تیار کر کے کرایہ پر دے دوں گا اور یہ مکان ہمیشہ کے لیے اپنے قبضے میں لے لیں گے۔پچھلے دس سال سے اس مکان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ہمارا بھی تو حق ہے اس پر۔''

''بڑھیا کو مکان دکھانے لے کر جاؤ گے کیا؟''

''ٹالنے کی کوشش کروں گا۔'' اور دونوں اس بوڑھی مکان مالکن سے پیچھا چھڑانے کی اسکیم سوچنے لگے۔

صبح جب راج رانی اُٹھی تو مائی پہلے سے ہی نہا دھو کر تیار بیٹھی تھی۔

''آج صبح صبح ہی تیار ہوگئیں۔ پانی گرم کیا تھا کیا؟''

''گرم کی کیا ضرورت ہے۔ بس جیسا تھا اسی سے نہا لیا۔''

''مگر آپ صبح صبح کہاں جانے کو تیار ہوئی ہیں؟''

''تمھارا گھر دیکھنے جانا ہے۔ راج کمار اٹھا کہ نہیں؟''

''ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، وہ تو ابھی سو رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، سو کر اٹھے گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔''

اس دن طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے راجکمار سارا دن اپنے کمرے کے اندر لحاف اوڑھ کر پڑا رہا۔ اگر بڑھیا نے مکان دیکھ لیا تو وہ یہ مکان خالی کرنے کو کہے گی اور ہمارا پلان دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ پریشانی کے عالم میں انسان خود سے بھی باتیں کرنے لگتا ہے۔ وہ مائی کو یہاں سے بھگانے کی ترکیب سوچتا رہا۔ لاٹھی بھی نہ ٹوٹے اور سانپ بھی مر جائے۔ اسے مہندر کو فون کر کے بلانا چاہیے۔ اُٹھ کر فون ملانے کی کوشش کرتا رہا مگر فون تھا کہ لگ ہی نہیں رہا تھا۔ یا تو وہ فون خراب ہے یا وہ لوگ گھر پر نہیں ہیں۔ تار دینی پڑے گی۔ مگر اس کے لیے بھی گھر سے باہر جانا پڑے گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی خراب طبیعت کا بہانہ زیادہ دن چل نہیں پائے گا۔

اگلی صبح بڑھیا پھر تیار ہو کر آنگن میں چارپائی ڈال کر بیٹھ گئی۔ صبح سے ہی اس کی رام کہانی شروع ہو گئی تھی۔ راج رانی کو گھر کے کئی کام نپٹانے تھے۔ مگر بڑھیا کی باتیں ختم ہوں تو وہ اٹھے۔ نہ جانے کتنی بار وہ یہ سب باتیں سن چکی تھی۔

''جب ہم ۱۹۴۷ء میں لاہور کی محل جیسی بھری پوری حویلی چھوڑ کر یہاں آئے تو سرکار نے یہ مکان دے دیا۔ ٹوٹا پھوٹا۔ مجبوری تھی کیا کرتے۔ اس وقت اس مکان نے میرے بچوں کو باپ کی طرح سایا دیا، انھیں سمیٹ لیا۔ پھر دھیرے دھیرے اس پر پیسہ لگا کر اتنا بڑا کیا۔ تو تو جانتی ہی ہے مجھے اس مکان سے کتنا لگاؤ ہے۔ مگر کیا کروں مہندر سے تو بڑھ کر نہیں ہے یہ مکان؟ اسے کاروبار میں اتنا نقصان ہوا ہے کہ مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ میں تو اتنے دن صرف اس لیے چپ تھی کہ تمھارا ابھی مکان بن جائے ایک بیٹے کی خوشی کے لیے میں دوسرے کو تو تنگ نہیں کر سکتی نا۔''

ٹھنڈی سانس بھر کر وہ اُداس ہوگئی۔ سب جانتے تھے کہ مائی کی جان اپنے بیٹے میں اٹکی ہوئی ہے۔

اب تو راج کمار کے لیے ٹالنا اور مشکل ہو گیا تھا۔ پرانے اڑوس پڑوس کے لوگوں میں مائی کے آنے کی خبر پھیل چکی تھی جسے پتہ چلتا وہ منہ اٹھائے ملنے چلا آتا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی اس کے خلاف مائی کو کچھ کہہ نہ دے۔ سب اس کی نیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے وہ مائی کو اکیلے بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

''راج کمار تو اسے مکان کہتا ہے؟ تو تو کہتا تھا چھوٹا سا مکان ہے۔ یہ تو اچھا خاصا مکان ہے۔ بہت خوبصورت بنایا ہے تو نے۔''

''یہ سب آپ کا آشیرواد ہے مائی۔''

''اپنی مائی کے لیے بھی کوئی کمرہ بنایا ہے یا نہیں؟''

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ سارا گھر آپ کا ہی تو ہے۔ جہاں چاہیں رہیں۔''

ایک ایک چیز مائی نے اچھی طرح نہاری۔ پھر مندر والے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں آرام سے زمین پر بیٹھ گئی۔

''بیٹا یہ کمرہ تو تو مجھے دے دے۔ مندر کے ساتھ والا کمرہ سمجھ لے میرا ہوا۔''

''آپ ہی کا ہے مائی۔''

''تو جا بیٹا جا کر میرا سامان یہیں لے آ۔ میرا تو یہاں سے جانے کو دل ہی نہیں کر رہا۔''

اب تک تو سب باتیں رسمی ہو رہی تھیں۔ اسے کیا معلوم تھا مائی سنجیدہ ہے۔

''مائی ابھی مکان میں پوجا کرائیں گے، پھر سامان لائیں گے۔''

''پوجا تو رہنے کے لیے کروانی ہے۔ رہوں گی تو میں بعد میں ابھی تو تو میرا سامان لے آ۔ وہ سامان جو تم لوگوں نے میرے کمرے سے اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے۔''

یہ بات سنتے ہی اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ مائی کو وہیں چھوڑ وہ سامان لینے چلا گیا۔ مہندر کو تار تو اس نے دے ہی دی تھی مگر جتنی دیر وہ نہیں آتا مائی کو تو ٹالنا ہو گا۔

راج رانی سے مائی کا تھوڑا سا سامان لے کر وہ نئے گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ کسی طرح وہ اسے وہاں سے لے آئے اور واپس روانہ کر دے پھر سامان تو وہ دوبارہ باہر پھینک دے گا۔ مائی نے باقی سامان کے بارے میں پوچھا تو اس نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

''باقی سامان ہمارے سامان کے ساتھ آ جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔''

''نہیں اب یہ کمرہ میرا ہوا۔ اب اس میں سے سامان مت نکالنا۔ نہیں تو میں تالا لگا دوں

گی۔‘‘

’’کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟ بھلا آپ کا سامان کیوں نکالوں گا، آپ کا اپنا گھر ہے۔‘‘

سامان رکھنے کے بعد مائی اطمینان سے اُٹھی اوراس کے ساتھ گھر لوٹ آئی۔ مگران دونوں سے سکون کوسوں دُور تھا۔ رات کو جب تار ملنے پرمہندر وہاں پہنچا تو دونوں کو راحت ملی۔

’’کیا ہوا راج تم نے تار دے کر کیوں بلایا؟ کیا گھر خالی کررہے ہو؟‘‘

’’نہیں نہیں یار ہم تو مائی کی خراب طبیعت دیکھ کر گھبرا گئے۔‘‘

’’مائی کی خراب طبیعت؟‘‘

’’جس روز سے آئی ہیں، طبیعت خراب چل رہی ہے۔‘‘

’’کیا کہا مائی یہاں آئی ہیں؟‘‘

’’آپ کو بتا کر نہیں آئیں؟‘‘

’’کہاں ہیں مائی؟‘‘

’’اپنے کمرے میں۔‘‘

کمرہ خالی تھا۔ سارا گھر چھان مارا، مائی کہیں نہیں تھیں۔ بستر کی سلوٹیں بتا رہی تھیں کہ کوئی ابھی اٹھا ہے وہاں سے۔

’’مگر کمرے میں تو کوئی نہیں ہے۔‘‘

’’نہ جانے کہاں چلی گئیں؟‘‘ وہ دونوں پریشان ہو اُٹھے۔

’’کس دن آئی تھیں وہ یہاں؟‘‘

’’سوموار کو۔‘‘

’’سوموار کو؟ سوموار کو جب صبح انھیں کسی نے فون پر یہ بتایا کہ تم لوگوں نے اس مکان پر قبضہ کرنے کے لیے ان کا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے تو ان کو زبردست دل کا دورہ پڑا۔ ایک ہی بات ان کی زبان سے نکلی 'وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔' اور وہ اس دُنیا سے ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔‘‘

دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مہندر کو دیکھتے رہ گئے۔

OO

وِشی کرن

کیا عورت کو سمجھنا واقعی بہت مشکل ہے یا یہ محض میرا وہم ہے۔ کل تک تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ میں شالنی کو بہت اچھی طرح سے سمجھتا ہوں، اس کی رگ رگ سے واقف ہوں، اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اس کے ہر انداز کو میں بخوبی جانتا ہوں مگر پچھلے کچھ روز سے میں اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور ہر بار مجھے ایسے لگتا ہے کہ میں اپنی شالنی، اپنی شریک حیات کو نہیں بلکہ کسی اجنبی کو جاننے کی جدّوجہد کر رہا ہوں۔ میری مچلتی تڑپتی اُمنگوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا جب شالنی ایک اجنبی کی طرح آ کر ملی۔ دل میں نہ جانے کتنے رنگین خیال سموئے میں ایک ماہ بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ اس دوران جب بھی آنکھوں کے سامنے شالنی کا الوداع کے وقت کا بجھا ہوا چہرہ اور روئی سوجی ہوئی آنکھیں گھوم جاتیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا۔ کئی روز سے اس سے فون پر بات بھی نہ ہو پائی تھی۔ اسے دیکھنے کو، اس کی آواز سننے کو، اسے سینے سے لگانے کو ترس گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو آگ اس طرف لگی ہے وہی آگ اس طرف بھی ہے مگر وہ اس طرح اجنبی کی طرح ملے گی اس کا مجھے گمان نہ تھا۔ میں تو یہ جانتا تھا کہ دو جسم مگر ایک جان ہیں ہم۔ ایک دوسرے کے بنا ادھورے، مگر یہ سب کیا ہوا؟ یہ کچھ روز کی دوری نے ہمارے پیار میں فرق کیوں ڈال دیا۔ لوگ تو کہتے ہیں دُور رہنے سے محبت بڑھتی ہے مگر میرے ساتھ یہ کیا ہوا۔ کیا یہ بے رُخی بناوٹی تو نہیں؟ مجھے دُور جانے کی سزا دے رہی ہے۔ مجھ پر اپنا غصہ اس انداز سے اُتار رہی ہے۔ میں کیسے بھول سکتا ہوں وہ رات ہمارے ملن کی آخری رات جسے ہم نے پل پل جیا تھا۔ جس رات کے سہارے میں ایک ماہ کی دُوری جھیل پایا تھا۔ اس رات نیند آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ صرف پیار ہی پیار۔ جدائی کا غم ہمیں اور قریب لے آیا تھا۔ شادی کے تین سال بعد یہ پہلا موقعہ تھا جب ہم اتنے عرصے کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے۔ وہ بھی ہم دونوں کی نوکریوں کی مجبوری تھی ورنہ یہ نوبت بھی نہ آتی۔ اس روز جب میں نے دفتر سے آ کر شالنی کو بتایا کہ ایک ماہ کے لیے دفتر کے کام سے شیلانگ جانے کا حکم ملا ہے تو اس نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔

''تم کہیں نہیں جا رہے۔ بس میں نے کہہ دیا۔''

''ضد مت کرو شالنی نوکری کا سوال ہے۔''

''میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ کہہ دیا سو کہہ دیا۔''

''تم ایسا کرو چھٹی لے لو۔ میرے ساتھ ہی چلو۔''

''کیا؟ مجھے اتنی چھٹی کیسے مل سکتی ہے۔ میری تو پرائیویٹ نوکری ہے۔''

بات اپنی نوکری پر آئی تو اس کا سخت لہجہ نرم پڑ گیا۔

''تم تو کہتے تھے میرے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتے؟''

''یہ تو میرا دل ہی جانتا ہے میں یہ دن کس طرح گزاروں گا۔ مجبوری ہے، کام تو کرنا ہی ہے۔''

''تمھارے بنا ایک ایک پل سال کے برابر گزرے گا۔''

اس نے میرے سینے سے لگتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا۔ اس کی سسکیوں نے مجھے اور بے چین کر دیا۔ میں نے اسے پیار سے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا، جیسے اس کا ہر درد ہر غم میں اس سے چھین لینا چاہتا تھا۔ پیار سے اس کا دامن بھر دینا چاہتا تھا اور پھر وہ آخری رات پیار کی نذر ہوگئی۔ پیار کے پل پنکھ لگا کر اُڑ جاتے ہیں۔ وقت کتنی جلدی گزر گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ اور وہ رات میٹھی میٹھی یادیں دے کر ہاتھوں سے پھسل گئی۔

دو روز مجھے واپس آئے بھی ہو گئے مگر شالنی سے اطمینان سے بات نہ ہو سکی۔

''کیا ایک روز کی چھٹی نہیں لے سکتیں؟'' میں نے تیار ہوتے اسے دیکھا تو کہہ دیا۔

''میرا آج جانا ضروری ہے۔ کوئی خاص بات تھی کیا؟''

''خاص بات تو یہی ہے کہ میں کچھ اطمینان کے پل تمھارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔ جس دن سے آیا ہوں اس دن سے آنے جانے والوں کا انتارش ہے کہ بات کرنے کا موقع بھی نہیں مل پایا۔''

''ابھی نہیں شام کو ملتے ہیں۔ کھانا بنا رکھا ہے۔ آرام سے کھا لینا۔'' اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں حیران و پریشان اس کے اس برتاؤ کا سبب سوچتا رہ گیا۔

میرے دماغ کے گھوڑے تیز رفتار سے دوڑنے لگے۔ ایسا کون سا شخص شالنی کو ملا جس سے وہ متاثر ہوگئی اور حالات بدل گئے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور سامنے میرے کالج کے زمانے کا دوست شری کانت کھڑا تھا۔ اتنے برسوں بعد اسے اس طرح سامنے دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا اس کے سوالوں نے مجھے چونکا دیا۔

''للت یار تم کب آئے؟''

میرا گھر اور مجھی سے پوچھ رہا ہے! میں نے خود کو سنبھالا اور اسے اندر لے آیا۔

''تمھیں کیسے پتا کہ میں گیا ہوا تھا؟''

''شالنی نے بتایا نہیں؟ میں تو کئی بار آیا ہوں تمھارے گھر۔ احسان مانو میرا تمھاری بیوی کا پورا خیال رکھا ہے۔ اسے کمی نہیں محسوس ہونے دی تمھاری میں نے۔''

اس کے اس جملے نے مجھے چونکا دیا۔ اب مسئلہ سمجھ میں آ گیا مگر اس کا سبب کیا ہے یہ جاننا ضروری تھا۔ باتوں باتوں میں میں نے ساری جانکاری لے لی۔ میرے جانے کے کچھ روز بعد وہ ہمارے گھر کا پتا کسی دوست سے لے کر آیا تھا۔ شہر میں نیا آیا تھا اس لیے اپنوں کی تلاش میں ہمارے یہاں تک پہنچ گیا۔ اب تک اکیلا تھا شادی نہیں کی تھی۔ دفتر سے اپنے گھر یا پھر ہمارے گھر کا راستہ معلوم تھا۔ گھر پر رہتا تو کبھی ٹی وی دیکھتا یا نجوم کے متعلق مختلف کتابیں پڑھتا۔ اس کے جانے کے بعد بہت سی دھندلی تصویریں صاف ہو گئیں۔

پچھلے پانچ سال کے واقعے آنکھوں کے آگے گھوم گئے۔ کالج کے وہ دن جب میری اور شالنی کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ وعدے، وہ قسمیں اور پھر ہمیشہ کے لیے ایک ہو جانے کا فیصلہ۔ ہمارے اس فیصلے سے دونوں گھر خوش تھے۔ دوست احباب سب شریک ہوئے تھے ہماری خوشی میں۔ اگر کسی کو رنج تھا تو وہ شری کانت تھا۔ کہنے کو وہ ہمارا دوست تھا مگر سبھی جانتے تھے کہ وہ بھی شالنی کو دل ہی دل میں پیار کرتا ہے مگر اپنی چاہت کا اظہار کرنے کی ہمت نہیں تھی اس میں مجھے بھی اس کی چاہت کی بھنک اس روز پڑی تھی جب وہ مجھے ہماری سگائی کی مبارک باد دینے آیا تھا۔

''تم بہت خوش نصیب ہو جو تمھیں تمھارا پیار مل گیا ہے۔''

''یار مبارک باد تو ہنس کر دو۔ اس طرح رونی صورت کیوں بنا رکھی ہے۔''

میرا انداق شاید اسے برا لگا تھا۔

''کیا کہوں دوست میری صورت ہی ایسی ہے بالکل میری قسمت کی طرح۔''

پھر اس کے وہاں سے جاتے ہی مجھے آفتاب نے بتایا تھا کہ اس کی نظر بھی شالنی پر تھی۔ ''مگر یار بازی تم مار گئے۔''

شادی کے بعد میں اکثر شالنی کو شری کانت کا نام لے کر چھیڑا کرتا۔

''شالنی تین سال ہو گئے ہماری شادی کو مگر تمھاری گود ابھی تک خالی ہے۔''

''تو؟''

''میں سوچتا ہوں اگر تمھاری شادی شری کانت سے ہوگئی ہوتی تو دو بچوں کی ماں تو وہ تمھیں بنا ہی دیتا۔''

اس کا چہرہ غصّے سے لال ہو جاتا اور جو چیز بھی اس کے پاس پڑی ہوتی اٹھا کر دے مارتی۔

''شرم آنی چاہیے اپنی بیوی سے اس طرح کا بے ہودہ مذاق کرتے ہوئے۔''

اور اس کا ناراض ہونا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ کتنی خوشامد کرنی پڑتی تب کہیں جا کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آتی۔

اور آج میری غیر موجودگی نے شری کانت کو شالنی کے قریب آنے کا موقع دے دیا۔ مگر شالنی اسے زیادہ پسند نہیں کرتی تھی اور پھر اس سے میل جول بڑھانا......؟ اتنا کھل کر تو وہ آج کل مجھ سے بھی بات نہیں کر رہی تھی اور اس کے ساتھ کس طرح کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کیا میری محبت میں کوئی کمی ہے؟ کیا ہمارا پیار اتنا کمزور ہے کہ چند روز کی دوری برداشت نہ کر پائے؟ نہیں نہیں مجھے شالنی پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ بقول اس کے میں تو ''رگِ جاں'' ہوں اس کی قربانیاں، اس کی محبت شک کے آگے دھندلی پڑنے لگیں۔ گھر کی ہر شے میں مجھے شری کانت کی صورت نظر آنے لگی۔ شالنی کے جسم پر مجھے شری کانت کے ہاتھ رینگتے نظر آنے لگے۔ گھٹن ہونے لگی مجھے اس ماحول سے اور میں گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا، پریشانی کے عالم میں خیالوں میں کھویا۔ اس بات کا علم ہی نہیں رہا کہ میں کتنی دُور نکل آیا ہوں۔ سورج ڈوبنے والا تھا اور اندھیرا اپنکھ پھیلانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آج نہ جانے کیوں قدم خود بخود قبرستان تک لے آئے تھے۔ عموماً اس طرف آنے سے میرا جی گھبراتا ہے وحشت ہوتی ہے مجھے قبرستان کے سنّاٹے سے، ان قبروں میں چین کی نیند سوئے ہوئے ان لوگوں سے۔ مگر آج ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ تڑپتے بے چین دل کو سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ چین کی نیند سوئے انجان لوگ آج مجھے اپنے لگ رہے تھے، میرے غم میں شریک، میرے ہمدرد۔ دور ایک درخت کے نیچے ایک فقیر دھونی رمائے بیٹھا تھا۔ میں بھی چپ چاپ جا کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور آگ سینکنے لگا کچھ پل ایک دوسرے کو ہم خاموش تکتے رہے پھر اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

''پھر وہی تماشا۔ تو تو گیا کام سے۔''

''کیوں؟''

''باقی عمر میری طرح اس قبرستان کی خاک چھاننا۔ ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔''

وہ پھر زور سے ہنسا۔

''کیوں؟''میں جھنجھلا کر بولا۔

''وہ اپنے بس میں نہیں ہے۔کسی نے اسے اپنے وش میں کر رکھا ہے۔رحم آ رہا ہے تیری جوانی پر۔''وہ پل مجھے دیکھنے کے بعد بولا۔

''بہت چاہتا ہے اسے؟''

''ہاں!''

اس کی تیکھی نظریں میرے اندر تک چھیدتی چلی گئیں۔نہ جانے کون سی سچائی تلاش کر رہا تھا وہ۔پھر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا اور میں آنکھیں جھپکائے بنا اسے دیکھتا رہا۔

''تیری محبت سچی ہے۔بھاگ جا یہاں سے،پھر پلٹ کر ادھر مت آنا۔تیرا وناش کرنے والے کو اس کی سزا مل گئی اور تجھے تیری محبت۔کوئی صدا کوئی آواز سنے تو پلٹنا مت بس سیدھے گھر جا۔کوئی تیرا انتظار کر رہا ہے۔''

''مگر بابا یہ سب کیا ہے؟''

''جو لوگ تنتر منتروں کا غلط استعمال کرتے ہیں انھیں سزا ملنی ہی چاہیے۔سوال مت کر۔بس یہاں سے چلا جا۔بھاگ جا۔پلٹ کر مت دیکھنا۔''

بنا کسی آواز کی پروا کیے میں سیدھا گھر پہنچا۔فقیر کی باتیں میرے دل و دماغ پر اس طرح چھا گئیں کہ مجھے کسی بات کا ہوش نہ رہا۔دروازے پر شالنی میرا انتظار کر رہی تھی۔میری اپنی شالنی جس نے دیکھتے ہی اسی اپنے پن سے ڈانٹنا شروع کر دیا جس کے لیے میں ترس رہا تھا،پریشان تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے بنا بتائے؟ معلوم نہیں کوئی آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

اس نے پھر ویسے ہی منہ پھلا کر بناوٹی غصّے سے کہا۔

میں کچھ کہہ پاتا اس سے پہلے فون کی گھنٹی بجی اور میں اس طرف لپکا۔دوسری طرف کوئی اجنبی بتا رہا تھا۔

''آپ کے دوست شری کانت کا بہت بڑا accident ہو گیا ہے۔''

''کہاں؟ کیسے؟''

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔بھگوان کا شکر ہے جان تو بچ گئی مگر......دونوں ٹانگیں کٹ گئیں۔آپ انھیں سول اسپتال جا کر مل لیں۔''

فقیر کے قہقہے مجھے اپنے گھر میں بھی سنائی دے رہے تھے۔

OO

پرکھ

پورے بائیس برسوں بعد آج گوری سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اتنے سالوں میں وہ بالکل بھی نہیں بدلی تھی۔ ویسا ہی چھریرا بدن، چہرہ ویسے ہی دمک رہا تھا جیسے جوانی کے دنوں میں چمکتا تھا اور آج بھی اس کے چہرے کی کشش برقرار تھی۔ بس بالوں میں سفیدی چھپانے کے لیے ہیئر کلر لگا ہوا تھا۔ اس ادھیڑ عمر میں بھی نہ جانے کیا جادو تھا اس کی شخصیت میں کہ ہر کوئی ایک بار تو پلٹ کر اس کی طرف ضرور دیکھتا تھا۔ میری توجہ بھی اس طرف میری بیٹی نے دلائی جب میں ساڑیاں خریدنے میں مصروف تھی۔

''ماں دیکھو، کتنی خوبصورت ہے وہ عورت'' بھاؤنا نے دوسری طرف اشارہ کیا۔

''ارے، یہ تو گوری ہے، میری بڑی پرانی دوست'' اور میں ساڑیاں کاؤنٹر پر چھوڑ کر اس کی طرف لپکی۔

''پہچانا نہیں گوری؟ میں راکھی ہوں۔ کالج میں ہم ساتھ پڑھتے تھے۔''

''ارے راکھی تم ہو، بہت بدل گئی ہو'' اور وہ بڑھ کر میرے گلے سے لگ گئی۔

ہم کئی سال کے بعد مل رہی تھیں، اس لیے ماحول کا بھی خیال نہ رہا۔ میں باتوں میں اتنی مشغول ہو گئی کہ بھاؤنا کو بھی بھول گئی۔ اس وقت چونکی جب بھاؤنا نے کہا۔

''ماں ساڑی کا کیا کرنا ہے؟''

''اوہ! میں تو بھول ہی گئی۔''

''گوری یہ میری بیٹی ہے بھاؤنا۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہے۔''

''بہت پیاری بچّی ہے۔''

''تمھارے بچّے بھی تو اب بڑے ہو گئے ہوں گے۔''

''دو بیٹے ہیں اور ان کی بھی شادی ہو چکی ہے۔''

''دونوں کی؟'' میں نے حیرت سے دیکھا۔
''میرے شوہر ملٹی ملینیئر ہیں۔ دونوں بیٹے ان کی پہلی بیوی کے ہیں۔''
''تمھارا اپنا؟''
''کوئی بچہ نہیں۔ خیر تم بتاؤ کبھی کوئی پرانا دوست ملا۔ رمیش شیکھر، سدھیر؟''
''ایک سے ہر روز ملتی ہوں۔ باقی دو کا مجھے معلوم نہیں۔''
''کس سے؟''
''سُدھیر، بھاوَنا کے پاپا۔''
''اوہ! سدھیر سے شادی ہوگئی تمھاری؟'' اس کی آواز میں خوشی کم اور افسوس زیادہ تھا۔
''کبھی بمبئی آنا ہو تو ہمارے یہاں آؤ۔''
''تم تو آئی ہوئی ہو۔ یہاں کل آجاؤ، ہمارے گھر'' اس نے پرس میں سے اپنا کارڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔
''کل صبح کی فلائٹ سے تو ہم واپس جا رہے ہیں۔ سُدھیر کی کانفرنس ختم ہوگئی ہے۔ بھاوَنا کی شادی پر اپنے میاں کو ساتھ لے کر ضرور آنا۔ سُدھیر کو بھی بہت خوشی ہوگی۔''
''ضرور آؤں گی مگر میرے شوہر کہیں آ جا نہیں سکتے۔ ایک ایکسیڈنٹ میں ان کی دونوں ٹانگیں خراب ہوگئیں۔'' اس نے بجھی آواز میں کہا۔
''اوہ! مجھے بے حد افسوس ہوا۔ ویسے تم زندگی سے خوش تو ہو نا؟'' میں نے اس کے چہرے کا تاثر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں بہت خوش ہوں۔ زندگی میں جو چاہا وہ مل گیا۔'' اس نے پھیکی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

پھر بھاوَنا کی شادی پر آنے کا پکا وعدہ کر کے وہ رخصت ہوگئی۔ اس کے چہرے پر جو رنجش کی لکیریں تھیں وہ نہ چھپ سکیں۔
''ماں کتنی خوبصورت ہے آپ کی دوست۔ کیا کالج کے دنوں میں بھی ایسی ہی تھی؟''
''بہت خوبصورت تھی۔ ہر کوئی اس سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے گزرے دن یاد کرتے ہوئے کہا۔
گزرتا وقت انسان پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے مگر گوری کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وقت

اس کو چھو کر بھی نہیں گیا، جیسے تھم سا گیا ہو۔ کالج کے دنوں میں میں بھی بالکل دُبلی پتلی تھی مگر اب دو بچوں کے بعد جسم بھر گیا تھا۔ جب سے موٹی ہوئی تھی شوہر نے راکھی کی جگہ ''مٹلو'' کہنا شروع کر دیا تھا۔ مگر بچوں کے سامنے اس نام سے کبھی نہیں پکارتے تھے۔ صرف اس وقت کہتے جب ہم دونوں اکیلے ہوتے۔ اور جب بھی میں ڈائٹنگ کی بات کرتی تو غصہ کرنے لگتے۔

''کیا ضرورت ہے ڈائٹنگ کی؟''

''اپنا خیال رکھنا بُری بات ہے کیا؟ اتنی موٹی ہو گئی ہوں، سجنے سنورنے کا مزا ہی نہیں آتا۔''

''میری مٹلو نے کس کو سج سنور کر دکھانا ہے؟''

''کس کو سے کیا مراد ہے؟ آپ کو اور کسے۔''

''مجھے تو تم ایسے ہی پسند ہو۔'' ان کی آنکھوں سے شرارت جھلکنے لگتی۔

''خود تو ابھی بھی ویسے کے ویسے ہو اور میرا جسم دیکھا ہے؟'' میں منہ بنا کر کہتی۔

''میری جان تم نے دو بچوں کو اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ میں نے نہیں۔''

''سب عورتیں بچوں کے بعد کہاں موٹی ہو جاتی ہیں۔'' میں لگاتار بحث کرتی جاتی۔

''تم جانتی ہو، میں نے تمھارے ظاہری حسن سے نہیں بلکہ باطنی خوبصورتی سے پیار کیا ہے۔ اگر تم موٹی ہو جاؤ یا بدصورت ہو جاؤ تو میرے پیار میں کبھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں جس طرح تم کو کل چاہتا تھا، آج بھی چاہتا ہوں اور کل بھی اسی طرح پیار کروں گا۔ ان فضول باتوں میں اپنا وقت خراب مت کرو۔ بس اچھی اچھی باتیں سوچا کرو۔''

ان کی پیار بھری باتیں مجھے راحت فراہم کرتیں اور ان کی بانہوں میں آتے ہی میں دُنیا کے سب غم بھول جاتی۔ ہماری شادی کو بیس برس ہو چکے تھے مگر آج بھی رشتے میں تازگی برقرار تھی۔ اب بھی میرا دل ویسے ہی دھڑکتا تھا جیسے کالج کے زمانے میں ان کو دیکھ کر دھڑکتا تھا۔ میں تو انھیں پہلی نظر میں دل دے بیٹھی تھی مگر ان کی نظر مجھ پر دو سال بعد پڑی وہ بھی گوری کی وجہ سے۔ آج اگر سدھیر میرے شوہر ہیں تو گوری کی بدولت ہیں۔

کالج کے بہت سے لڑکوں کی طرح سدھیر بھی گوری پر عاشق تھے جو آزاد خیالات کی خوبصورت لڑکی تھی، دوستی سے زیادہ اور کوئی رشتہ قائم کرنے کی قائل نہیں تھی۔ سب لڑکیاں اسے چھیڑتیں ''عاشقوں کی فہرست لمبی ہوتی جا رہی ہے مگر تم کس کو دل دو گی دیکھنا یہ ہے وہ کون خوش نصیب ہو گا؟''

''بھول جاؤ میری جان ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ میں محبت، عشق وغیرہ ان سب فضول کے جذبات پر یقین نہیں کرتی۔ کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا، سب رشتے مطلبی ہوتے ہیں۔ اور پھر آدمی ذات سے وفا کی امید؟ توبہ توبہ ایسا گناہ میں نہیں کر سکتی۔'' وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہتی۔

''کیا ساری عمر مرد کے بنا ہی گزار دو گی؟''

''نہیں ایسا بھی نہیں۔ مرد مجھے ایسا چاہیے جس کے پاس بے شمار دولت ہو اور جو میری ہاں میں ہاں ملائے۔ میں کہوں دن ہے تو وہ رات کو بھی دن کہے۔ جوتی کی نوک پر رکھوں گی اپنے شوہر کو۔'' غرور سے گردن اکڑا کر کہتی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمھیں پیار کرنے والا شوہر نہیں بلکہ پیسے کا غلام چاہیے۔''

''ایسا ہی سمجھ لو۔'' وہ لاپروائی سے جواب دیتی۔

وہ جتنی خوبصورت تھی اتنی ہی سنگ دل بھی۔ شاید اس کے گھر کا ماحول ہی ایسا تھا جس نے اسے بے حس بنا دیا تھا۔ اس نے بچپن میں اپنے باپ کو ماں پر ظلم کرتے اور ماں کو تل تل کرتے مرتے دیکھا تھا۔ اس کا درد، اس کے آنسو، اس کی بے بسی نے اس کے معصوم دل پر جو نقش چھوڑے تھے شاید اس کی شخصیت آج ایسی ہو گئی تھی۔ میں اس کی خاص سہیلی تھی اور اس کی خوشی اور غم میں شریک رہتی۔ کالج میں بھی ہم دونوں اکثر ساتھ ساتھ ہوتی تھیں اور جو لوگ اس تک پہنچنے میں ناکام ہوتے تھے وہ کسی نہ کسی بہانے مجھ سے دوستی کرنا چاہتے تھے۔ سُدھیر بھی ان میں سے ایک تھا۔ اس نے کبھی مجھے غور سے نہیں دیکھا تھا۔ شاید میں اس قابل تھی بھی نہیں کہ کسی کی نظر مجھ پر ٹک جاتی۔ درمیانہ قد، سانولی رنگت، سیدھا سادہ لباس اور سیدھی سی لمبی چوٹی۔ اس کے برعکس گوری کا دمکتا ہوا رنگ، کالی موٹی موٹی ہرنی جیسی آنکھیں، بل کھاتی کمر اور کٹے ہوئے بال بات کرتے ہوئے جب وہ بالوں کو پیچھے جھٹکا دیتی تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ کبھی وہ ساڑی پہن کر آتی تو کبھی Jeans اور کبھی چوڑی دار پائجامہ تو کبھی شلوار قمیض۔ لوگوں کو فرصت کہاں ملتی تھی کہ اسے چھوڑ کر میری طرف دیکھتے۔

جب گوری سے دوستی کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے تو کسی نہ کسی بہانے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی کوئی کتاب طلب کرتے تو کبھی نوٹس۔ کبھی ملاقات لائبریری میں ہو جاتی تو کبھی کینٹین میں۔ اور پھر میرے ذریعہ وہ بھی گوری کے خاص دوستوں میں شامل

ہو گئے۔ سدھیر گوری کی قربت سے کافی خوش تھے مگر میں جانتی تھی کہ دوسرے دوستوں کی طرح وہ بھی صرف ایک دوست ہیں اس سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ گوری کا شیکھر، راجیش سے کھلے پن سے ملنا جلنا ان کو بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اس سے کچھ کہہ نہیں پاتے تھے مگر دل میں جل کر رہ جاتے اور انھیں اس طرح گوری کے لیے تڑپتے دیکھ میں دل مسوس کر رہ جاتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ ایسا وقت بھی آ گیا جب وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے، اپنا دکھ درد مجھ سے بانٹنے لگے۔ ایک روز گوری کی سال گرہ کے موقعے پر سدھیر دو گلاب کے پھول لے کر آئے اور مبارک باد کے ساتھ بہت محبت سے پیش کیے۔ گوری نے منہ بنا کر ان پھولوں کی طرف دیکھا اور ''شکریہ'' کہہ کر لیتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ دو قدم چلتے ہی وہ پھول پھینک دِیے۔ سب کی نظریں بچا کر میں نے وہ پھول اُٹھا لیے اور کتابوں میں چھپا لیے۔ بے شک یہ پھول میرے لیے نہیں تھے مگر دِیے تو انھوں نے تھے اور وہ بھی پیار اور محبت کے جذبے سے لب ریز ہو کر۔

ایک روز پریشانی کی حالت میں سدھیر میرے پاس لائبریری میں آئے:

''راکھی جلدی چلو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں تم سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''کہو؟''

''کینٹین میں بات کرتے ہیں۔''

''چلو۔''

چائے کے دوران بات کا سلسلہ آگے بڑھا۔

''آج گوری نے میرے ساتھ فلم دیکھنے کا وعدہ کیا تھا مگر میں انتظار کرتا رہا اور وہ شیکھر کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھومنے چلی گئی۔''

''تو؟''

''تو کیا؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں وہ کسے چاہتی ہے؟''

''وہ تم دونوں کو چاہتی ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''وہ تمھیں اور شیکھر کو دوست سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتی۔ وہ کسی سے پیار نہیں کرتی اور

ان فضول کے جذبوں میں وقت برباد نہیں کرتی۔''

''دیکھو راکھی تم میری اچھی دوست ہو نا۔ میری سفارش کرو نا۔'' اس نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔

''نوکری کے لیے؟''

''کیسی انجان بن رہی ہو۔''

''تمھیں شاید میری بات اچھی نہیں لگے گی مگر ایک دوست کی حیثیت سے میں تمھیں سمجھانا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ دوستی کی جا سکتی ہے مگر پیار نہیں۔ پیار تو بس ہو جاتا ہے اس کے لیے کسی کی سفارش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ گوری کسی سے پیار کر ہی نہیں سکتی۔ اس لیے تم اپنا وقت برباد مت کرو۔''

سُدھیر کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ شاید میری باتوں سے ان کے سپنوں کا محل ٹوٹ گیا تھا یا آس کا پنچھی ہاتھوں سے اڑ گیا تھا۔ میں اور رُک نہ سکی اور انھیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

کئی روز تک سدھیر نے مجھے اپنی صورت نہیں دکھائی۔ ایک شام لائبریری میں دیکھا تو بُلائے بنا رہ نہ سکی۔

''اتنے دنوں سے کہاں ہو؟ ملے بھی نہیں۔ اس روز کی بات سے ناراض ہو گیا؟''

''غلطی تو میری تھی پھر تم سے ناراض کیسے ہو سکتا ہوں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ پیار مانگنے یا زبردستی پانے والی چیز نہیں۔ شاید میری قسمت میں ہے ہی نہیں۔''

''ہر کسی کو پیار کے بدلے پیار نہیں ملتا۔ بہت کم خوش نصیب ہوتے ہیں۔ ابھی تو پوری زندگی پڑی ہے۔ شاید کبھی تمھیں کوئی اور پسند آ جائے۔'' میں نے انھیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اب میں تم لوگوں کو کبھی پریشان نہیں کروں گا۔''

''یعنی دوستی ختم۔''

''پگلی، تم سے تو دوستی برقرار رہے گی۔''

''وعدہ۔''

''پکا وعدہ'' انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

اور سچ میں انھوں نے وعدہ پورا کر دکھایا۔ کالج کے دن ختم ہوئے اور گوری امریکہ چلی

گئی۔ تعلیم مکمل کر کے سب روزی روٹی کمانے کی فکر میں لگ گئے۔ سدھیر نے بھی ایک پرائیویٹ فرم میں ملازمت کر لی اور مجھے بھی ایک سرکاری اسکول میں ملازمت مل گئی۔ سدھیر کو جب بھی وقت ملتا، ملنے گھر چلے آتے۔ کبھی کبھی تو مہینہ گزر جاتا اور کبھی دوسرے دن ہی آ جاتے۔ دراصل جب کبھی ان کی زندگی میں کوئی خاص حادثہ ہوتا یا کوئی الجھن آن پڑتی، انھیں میری یاد آ جاتی۔ خود کو مجھ پر اتنا dependent کر دیا تھا کہ اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔ اور جب سب ٹھیک ہو جاتا تو میں جھٹ سے کہہ دیتی۔

''لاؤ میری فیس لاؤ۔''

''اس جنم میں تو دے نہیں پاؤں گا۔ اُدھار کر لو۔''

''اگلے جنم میں بھی اسی طرح میری جان کھاؤ گے کیا؟''

''ارادہ تو یہی ہے۔''

ایک روز سُدھیر ہمارے یہاں آئے تو گھر میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ بابو جی نے سُدھیر کا ان لوگوں سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ سُدھیر ہے۔ راکھی کا بہت اچھا ساتھی اور سُدھیر ان سے ملو۔ یہ کپور صاحب ہیں، کینیڈا میں انجینئر ہیں اور راکھی کو دیکھنے آئے ہیں۔''

سدھیر ان لوگوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا اور تھوڑی دیر بعد میرے کمرے میں آتے ہی وہاں سے نکل پڑا۔ اس رات پہلی بار سدھیر کو جو چبھن محسوس ہوئی اس سے وہ واقف نہ تھا۔ ساری رات انھوں نے آنکھوں میں گزاری اور ایک ایک لمحہ جو میرے ساتھ گزارا تھا انھیں ستانے لگا۔ جدائی کے احساس سے ہی وہ کانپ اٹھا۔ پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ وہ جسے دوستی سمجھتا رہا دراصل وہ پیار تھا اور گوری کے ساتھ کیا اس نے پیار نہیں کیا؟ وہ پریشان ہو اٹھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ گوری کی طرف محض ایک کشش تھی اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

صبح ہوتے ہی وہ میرے گھر آ پہنچا۔

''سدھیر تم اس وقت؟ سب خیریت تو ہے؟'' بابو جی نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

''بابو جی مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''

''کہو بیٹا۔''

''میں راکھی کے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔ اس کا احساس مجھے آج ہوا ہے۔ میں آپ

سے راکھی کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔ مجھے انکار مت کریے گا۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

''راکھی بھی یہی چاہتی ہے کیا؟''

''میں اسے ہر طرح سے خوش رکھوں گا بابو جی۔''

''مگر راکھی کی مرضی بھی تو پتا چلے۔''

''میں راکھی سے ابھی پوچھ کر آیا۔'' اور بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ بابو جی اسے حیران پریشان دیکھتے رہ گئے۔ ''راکھی تم کسی اور سے شادی نہیں کر سکتیں۔'' آواز میں رعب تھا۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟''

''تم میرے بغیر زندہ رہ پاؤ گی کیا؟''

''معلوم نہیں۔''

''میں نہیں رہ پاؤں گا تمھارے بغیر۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں راکھی۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔''

''گوری سے بھی تو تم نے پیار کیا ہے۔''

''وہ پیار نہیں تھا صرف ایک کشش تھی۔ اصلی پیار تو میں نے تم سے کیا ہے۔ پیار کے کیا معنی ہوتے ہیں یہ تو مجھے اب معلوم ہوا ہے۔ پیار کے لیے جسم نہیں بلکہ دل کی خوبصورتی ضروری ہے۔ یہ بھی مجھے تم سے پتہ چلا ہے۔ کہو مجھ سے شادی کرو گی؟''

''مجھے تھوڑا وقت دو سوچنے کے لیے۔''

''اس میں سوچنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں زندگی بھر تمھیں پیار کروں گا۔ دُنیا بھر کی خوشیاں تمھارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ تم صرف ہاں کہہ دو۔''

''تم کہتے ہو تو ہاں کہہ دیتی ہوں۔'' میں نے بڑا احسان کرتے ہوئے کہا۔

مجھے خود اپنی قسمت پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے جس محبت کو سب سے چھپا کر رکھا جس کی بھنک میں نے سدھیر کو بھی نہ پڑنے دی اور میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ یہ جذبہ میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔ آج اس طرح خود میرے پیار نے آ کر میری جھولی خوشیوں سے بھر دی۔ یہ ایک معجزہ ہی تو تھا۔

شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی اور پہلی رات ہی جب سدھیر نے مجھے سونے کے کنگن

تحفے میں دِیے تو میں نے بھی ایک چھوٹی سی چاندی کی ڈبیہ ان کی طرف بڑھا دی۔

''یہ آپ کے لیے ہے۔''

''کیا ہے اس میں۔''

''کھول کر دیکھ لو۔''

ڈبیہ کھولی تو اس میں گلاب کے سوکھے ہوئے دو پھول تھے۔ ''یہ کیا؟''

''یہ وہ پھول ہیں جو تم نے گوری کو دِیے اور اس نے پھینک دِیے میں نے انھیں اٹھا کر سنبھال کر رکھ لیا اور آج تک کس لیے رکھا ہے جانتے ہو؟''

وہ پریشان تھے۔ حیرت سے میرا چہرہ تک رہے تھے۔

''اب بھی نہیں سمجھے؟'' خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔

انھوں نے آگے بڑھ کر میرے آنسوؤں سے بھیگے رخسار چوم لیے اور مجھے میری محبت کا صلہ مل گیا۔ میں دُنیا بھول کر ان کی باہوں میں سمٹ گئی۔

آج پھر گوری سے مل کر دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا کیونکہ اگر وہ اس ہیرے کو پتھر سمجھ کر نہ پھینکتی تو میری زندگی خوشیوں سے محروم ویران صحرا کی طرح ہوتی۔

OO

انتقام

آدھی رات کو جب سناٹے کو چیرتی ہوئی گاڑی گھر کے سامنے آ کر رُکی، تو معمول کی طرح نیلا گرم بستر چھوڑ کر ٹھٹھرتی سردی میں کھڑکی کے پاس سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے لگی۔ کُہرے کی وجہ سے وہ صاف دیکھ تو نہیں پائی مگر یہ منظر تو اس کے دل و دماغ پر صاف نقش تھا۔ للیتا کا لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی سے نکلنا اور دوسری طرف سے کسی مرد کا بڑھ کر اسے سہارا دینا اور دیر رات تک اس کے کمرے میں رہنا۔ آج پھر یہ کون نیا مرد اس کی ماں کو سہارا دے کر اس کی خواب گاہ میں پہنچ گیا۔ سواتی کا چہرہ نفرت سے سکڑ گیا۔ بچپن سے جوانی کا سفر اس نے ایسے ہی شرمناک مناظر دیکھ دیکھ کر طے کیا تھا۔ بالکل تنہا۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن اور نہ کوئی دوست۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر پھُسپھساتے کیوں ہیں، عجیب نظروں سے اسے دیکھتے ہیں اور اپنے بچوّں کو اس سے دُور رہنے کی تاکید کرتے ہیں۔ مگر بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اسے سمجھ میں آنے لگا تھا کہ لوگ اس سے کتراتے کیوں ہیں۔ اس پر طعنے کیوں کستے ہیں۔ جب وہ چار سال کی تھی تو اس کے والد کسی اور کی خاطر اپنی بیوی اور اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس کے بعد اس کی ماں بھٹک گئی۔ اونچی سوسائٹی کی مطلقہ دولت مند عورت نے باقی کی زندگی ہر بندھن سے آزاد ہو کر عیش میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سماج کی، رشتہ داروں کی یہاں تک کہ اپنے خون کی پرواکرنی بھی چھوڑ دی۔ کلب، پارٹیاں، شراب اور ہر روز نئے دوست، نئے مرد اس کی زندگی بن گئے۔ ماں بیٹی میں صرف نام کا رشتہ رہ گیا تھا۔ سواتی کو تو یاد بھی نہیں کہ کب اس کی ماں نے کچھ پل اس کے ساتھ گزارے، کب اسے پیار سے پچکارا اور سینے سے لگایا۔ وہ تو آیا کی گود میں، اس کی دیکھ ریکھ میں پل کر جوان ہوگئی۔ جب جب اس نے ماں کے بارے میں سوچا، دوسرے بچوں کی ماؤں کو دیکھا تب تب اسے تنہا ہونے کا احساس شدّت سے ہوا۔ اس کی نفرت بڑھتی گئی۔ اسکول سے سیدھے وہ اپنے کمرے میں اور وہیں سے اسکول۔ اپنا ہر دکھ ہر غم اس نے

اپنے کمرے میں پڑے کھلونوں سے بانٹتا۔ شام ڈھلتے ہی ماں بج سنور کر کلب کے لیے روانہ ہو جاتی اور رات دیر سے کسی نہ کسی نئے مرد کے ساتھ لڑکھڑاتے قدموں سے لوٹتی۔ صبح ہونے سے پہلے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز آتی اور اسے پتا چل جاتا کہ وہ شخص چلا گیا ہے۔ صبح اس کی ماں دیر تک سوئی رہتی اور وہ اسکول چلی جاتی۔ بچپن میں جب بھی دُنیا والوں سے تنگ آ کر اس نے ماں سے کوئی سوال کیا تو جواب میں یا تو اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا جاتا یا پھر تھپڑ رسید کر کے۔ ایک بار جب وہ چانٹا کھانے کے بعد روئی چلائی تھی تو ماں نے بہت بُری طرح پھٹکارا تھا:

''بوجھ ہے تو میری زندگی کا۔ خود تو چھٹکارا پا گیا مگر میرے سر پہ مصیبت تھوپ گیا۔''

غصّے سے پیر پٹکتی اس کی ماں وہاں سے چلی گئی۔ ننھی سی سواتی اس روز بہت روئی تھی اور اسے چپ کرانے والا بھی وہاں کوئی نہ تھا۔ خود ہی روتے روتے سو گئی۔ اس دن کے بعد اس نے ماں سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا۔ یہ بات اس کے دل میں گھر کر گئی کہ اس کی کسی کو ضرورت نہیں۔

آج نہ جانے کیوں نفرت کی وہ چنگاری جو اس کے سینے میں دفن تھی، دہک اٹھی۔ شاید وقت آ گیا کہ وہ اندر پنپتے اس جذبہ کو باہر نکال دے، اُگل دے اس نفرت کو اور انتقام کے ذریعے ٹھنڈی کر دے اس آگ کو۔ انتقام اس ماں سے جس نے اس سے اس کا بچپن چھین لیا، اس کی معصومیت کو چھلنی کر دیا۔ اپنی عیاشی کے لیے اسے پیار اور ممتا سے محروم کر دیا۔ اس کا بچپن لوگوں کی نفرت اور ذلّت سہتے ہوئے گزرا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنے درد و کرب کو واپس لوٹا سکے۔ اس نے اپنے سراپا کو قد آدم آئینے میں نہارا۔ بندھے ہوئے بال کھلے چھوڑ دیے اطمینان کی لمبی سانس لی اور دوبارہ بستر کی آغوش میں چلی گئی۔

اگلے روز خاص سلیقے سے تیاّر ہو کر کالج سے سیدھے کلب پہنچ گئی۔

شام کو جب للیتا کلب جانے کے لیے نکلنے ہی والی تھی کہ گاڑی آ کر رُکی اور اس میں سے لڑکھڑاتے قدموں سے سواتی باہر نکلی اور جو شخص کل رات للیتا کے ساتھ تھا وہی نیلا کو سہارا دے کر اندر لے جانے لگا۔ للیتا سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ غصّے سے چلاّتی ہوئی اس نے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

''کچھ بھی تو نہیں۔ آج تک جو کچھ تم نے مجھے دیا ہے بس وہی لوٹانا ہے مجھے۔''

اتنا کہہ کر وہ اس شخص کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔

○○

مغرور

ڈاکٹر آنند ایک نامی گرمی ڈاکٹر تھے۔ اُن سے وقت لینا بہت مشکل کام تھا۔ سال میں صرف چار مہینے وہ ہندوستان میں ہوتے، باقی کا وقت امریکہ میں گزرتا۔ چالیس سال کی عمر میں انھوں نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ کانت امریکہ کے ڈاکٹروں کو اپنے بیٹے چراغ کی ساری رپورٹس بھیج چکا تھا مگر ڈاکٹر ولیم نے اُسے مشورہ دیا تھا کہ یہاں آنے سے بہتر ہے کہ ایک بار ممبئی میں ڈاکٹر آنند کو دکھا دیا جائے۔ ممبئی کا سنتے ہی اُسے اپنے دوست سجل کا خیال آیا اور فوراً اُس نے اُسے فون کر ڈالا۔

''یار میں بہت پریشانی میں ہوں۔ میری مدد کرے گا؟''

''مدد کی کیا بات ہے تو حکم کر کے دیکھ۔'' سجل نے عادتاً گرم جوشی سے کہا۔

''یار کوئی تین مہینے پہلے میرے یہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔''

''ارے یہ تو بہت خوشی کی بات ہے مگر تو آج بتا رہا ہے اور وہ بھی اس طرح؟'' اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ بولا۔

''تیرا گلہ جائز ہے مگر تجھے بتاتا تو کیا بتاتا۔ خوشی تو ملی مگر آدھی ادھوری۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا بیٹا اپاہج ہے۔ اُس کے دونوں ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہیں۔'' اُس کی آواز یہ کہتے ہوئے لرز گئی۔

''اوہ!''

''ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ کافی حد تک یہ ٹھیک ہو سکتا ہے اگر اس کا علاج ابھی کروایا جائے۔ میں نے ساری رپورٹس امریکہ بھیج دی تھیں مگر وہاں کے ڈاکٹر ولیم نے مجھے پہلے ممبئی میں ڈاکٹر آنند سے ملنے کا مشورہ دیا ہے۔''

''ڈاکٹر آنند آرتھوپیڈیکس کے ڈاکٹر، تو اس کی فکر مت کر سمجھ تیرا کام ہو گیا۔ میں اُس سے بات کر کے تجھے دوبارہ فون کرتا ہوں۔ بھابی کا کیا حال ہے؟''

''جیسا ایک ماں کا ہونا چاہیے۔ بہت بدل گئی ہے یار وہ۔''

''تو فکر مت کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر آنند کے بس میں جو ہو سکا وہ ضرور کرے گا۔''

سجل نے اُسے حوصلہ دے کر فون بند کر دیا اور ساتھ ہی ڈاکٹر آنند کو فون ملایا۔

''یار آنند کئی روز ہو گئے تمھارے دیدار کو آنکھیں ترس گئیں، کہاں رہتے ہو؟''

''کیا بات ہے۔ بہت چکنی چپڑی باتیں کر رہا ہے، ماجرہ کیا ہے؟''

''جب کوئی عید کا چاند ہو جائے تو اسی طرح اُس سے بات کی جاتی ہے جناب!''

''اصل بات پر آ جا جلدی۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بتا کیا کام ہے؟''

''کام بعد میں، پہلے یہ بتا آج شام کو کتنے بجے آ رہا ہے؟''

''کوئی خاص بات؟''

''خاص یہ کہ کئی روز ہو گئے ہم پیالہ ہم نوالہ نہیں ہوئے۔ بس شام سات بجے تیرا اور بھابی کا انتظار رہے گا۔''

''شرمیلا تو میکے گئی ہوئی ہے اور میں اتنی جلدی نہیں آ سکتا۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا۔ بس میں انتظار کروں گا شام سات بجے۔'' اس کے ساتھ ہی سجل نے اُس کی بات سُنے بغیر فون کاٹ دیا۔

''یہ نہیں سدھرے گا۔'' مسکراتے ہوئے ڈاکٹر آنند نے فون بند کر دیا۔

ڈاکٹر آنند جانتا تھا کہ آج اُسے سجل کے یہاں جانا ہی پڑے گا۔ سجل اس کا بہت پرانا اور اچھا دوست ہے۔ اُن کی دوستی اُس زمانے کی ہے جب وہ مقام حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا۔ آج جس بلندی پر وہ کھڑا ہے اس میں سجل نے اُس کا بہت ساتھ دیا تھا اور پھر سجل اتنے پیار سے اسے دعوت پر بلائے اور وہ نہ جائے، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

ٹھیک سات بجے ڈاکٹر آنند سجل کے گھر پر تھا۔ سمندر کے کنارے بیسویں منزل پر سجل کا پانچ کمروں والا بڑا سا فلیٹ بہت خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ دونوں میاں بیوی خوش طبیعت، خوش مزاج اور فراخ دل و دماغ کے مالک ہیں۔ ہر بات میں قہقہے، ہر بات میں مذاق، یہاں آ کر کوئی کتنا بھی غم گین انسان کیوں

نہ ہو، وہ بھی اپنا غم بھول جاتا ہے۔ اگر اُس کے کسی دوست کے دل پر غبار چھایا ہو تو وہ اس کے درد کو ایسے سمیٹ لیتا کہ دوسرے کو اندازہ نہیں ہوتا کہ کب بادل چھٹ گئے۔

دراوزہ کھولتے ہی پہلے تو شرمیلا کو ساتھ نہ لانے کی وجہ بتانی پڑی پھر کہیں جا کر اُسے اندر گھسنے دیا گیا۔ بیٹھتے ہی وہی ہنسی مذاق کی باتیں شروع ہوگئیں۔ جام سے جام ٹکرانے شروع ہوئے تو سنجیدہ باتوں کا دور چل نکلا۔ سرمئی شام، ہلکی مدّھم کمرے میں پھیلی روشنی اور کھلی کھڑکی سے سمندر کی لہروں کا سنگیت اور اس پر دھیمے دھیمے بجتا جگجیت سنگھ کی غزلوں کا ریکارڈ۔

''یار تیری شراب میں وہ نشہ نہیں ہوگا جو اس وقت ماحول کا سرور لطف دے رہا ہے۔'' پہلا سِپ لیتے ہوئے ڈاکٹر آنند نے کہا۔

''نہ تو یہ شراب کا، نہ ماحول کا، یہ تو میری صحبت کا نشہ ہے جو تجھے مزا دے رہا ہے۔'' سجل نے اپنے کالر اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''رہنے دے رہنے دے...... وہ بات بتا جس کے لیے آج مجھے بلایا ہے۔''

''تو جانتا ہے میرے دوست کانت کو جو دلّی میں رہتا ہے؟''

''وہ تو نہیں جو خوبصورت لڑکیوں کا دیوانہ ہے؟''

''ہاں وہی۔ مگر یار شادی کے بعد تو وہ جورو کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ ویسے تو ایسی خوبصورت بیوی کا شوہر میں ہوتا تو میں بھی اُس کا غلام بن جاتا۔''

''تیری بیوی خوبصورت نہیں۔ بلاؤں بھابی کو۔'' اُس نے دھمکی دی۔

''مگر وہ بات کہاں۔ لمبا قد، چاندی جیسا دمکتا ہوا رنگ، موٹی موٹی غزال چشم، تیکھا نقشہ، بھرے بھرے گلابی ہونٹ، گھنے کالے لمبے بال، بل کھاتی لمبی چوٹی جب اِدھر سے اُدھر لہراتی تو لوگوں کی نظر اُس کی نازک کمر پر ٹھہر جاتی۔ اُس کی چال میں ایسا بانکپن کہ چلے تو دل اُس کے قدموں میں ڈال دینے کو جی چاہے۔''

''بس بس کسی لڑکی کی بات کر رہا ہے یا آسمان کی اپسرا کی؟''

ڈاکٹر آنند نے سجل کو بیچ میں ٹوک کر کہا۔

''ارے بھائی آنکھوں دیکھا حال بتا رہا ہوں۔ کانت نے بھی جب اُسے پہلی بار کسی شادی میں دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ پہلی نظر میں اس پر فدا ہو گیا۔ ایک رئیس خاندان کا اکلوتا وارث جو خوبصورتی کا شیدائی مانا جاتا تھا اس خوبصورتی کو پانے کے لیے مچل اُٹھا۔ وہ اُسے

اپنے گھر کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ بس اُس خوبصورتی کا اَتا پتا معلوم کیا اور دوسرے ہی روز ماں کو اُن کے گھر رشتہ لے کر بھیج دیا۔ ایک متوسط گھر کی لڑکی کو ایک خوبصورت نوجوان، جس کا شمار شہر کے گنے چنے رئیسوں میں ہوتا ہے، انھیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ بس ہاں ہو گئی۔''

''یار پیسے میں بہت طاقت ہے۔'' ڈاکٹر آنند نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔ دولت سب عیب چھپا لیتی ہے۔ غریب وہی کام کرے تو عیب اور امیر کرے تو شوق۔'' سجل دوسرا پیگ بنانے کے لیے اُٹھ کر بار کی طرف چل پڑا جو ڈرائنگ روم کے شمالی کونے میں سجی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر آنند کی آنکھوں کے سامنے ویسا چہرا گھوم گیا جیسے حسن کی تعریف سجل نے کی تھی۔ اُس چاند کو پانے کی تمنا کی تھی اُس نے اور ہمت کر کے اُسے حاصل کرنے کے لیے پیغام بھی بھجوا دیا تھا مگر وہ چاند اُس کی تقدیر میں نہیں تھا۔ جب اُس چاند نے اُس کے سامنے آئینہ رکھ دیا تو وہ منہ کے بل گر پڑا چوٹ اتنی زور سے لگی کہ سنبھلنے میں کافی وقت لگ گیا۔ زخم تو بھر گئے مگر نشان اب بھی باقی تھے۔

''کہاں کھو گیا یار؟'' سجل نے اُس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے اُسے تخیّل کی دُنیا سے واپس بلایا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ کوئی بھی انسان مکمّل نہیں۔ ہر کسی کی سبھی خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ اگر اُسے خوبصورت بیوی مل گئی تو کیا وہ دُنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے؟''

''نہیں یار۔ خوبصورتی ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ اُس چاند میں بھی اک داغ ہے۔ اور وہ داغ ہے غرور کا۔ اُسے اپنے حسن، اپنی خوبصورتی پر اتنا غرور ہے کہ وہ عام لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ ایک بار اُس کے گھر اس کا نوکر اپنی کسی رشتے دار کو لے آیا کہ اُسے بھی کام پر رکھ لو تو اُس نے ایک منٹ بھی اُس عورت کو وہاں کھڑا نہیں ہونے دیا۔ جانتے ہو کیوں؟''

ڈاکٹر آنند نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیونکہ وہ عورت بدصورت تھی، غریبی اُس کے روم روم سے جھانک رہی تھی، اُس کے بدن پر پرانے پھٹے ہوئے بدبودار کپڑے کانت کی بیوی کے ناک سے دماغ پر چڑھ گئے اور اُس نے دونوں کو خوب ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔ پھر سارے گھر میں گلاب کی خوشبو والا room freshner چھڑکا۔ یہ سب باتیں خود مجھے کانت نے بتائیں۔ اور جب میں نے اس

بات کی نکتہ چینی کی تو وہ جھینپ گیا۔ اور اُس کی صفائی میں بولا کہ اُسے خوبصورت چیزیں پسند ہیں، کسی طرح کی بدصورتی وہ پسند نہیں کرتی۔ اُسے بدصورت چیزیں دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ اور قدرت کا کھیل دیکھو، اس کے گھر پانچ سال بعد اولاد ہوئی اور وہ بھی آدھی ادھوری۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کے دونوں ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہیں۔''

''اوہ!''

''اسی سلسلے میں وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ایسے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جب چاہو بلا لو۔ بچّے کی تکلیف جتنی جلدی دُور ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے۔''

''تو پھر پانچ تاریخ ٹھیک ہے؟''

''بالکل۔''

اس بچّے کے ذکر کے بعد نہ جانے کیوں ڈاکٹر آنند کا دل بجھ سا گیا۔ خوبصورت شام کا سرور دل پر ایک بوجھ چھوڑ گیا۔ اُس رات اُسے نیند نے بھی اپنے دامن میں لینے سے انکار کر دیا۔ بچپن کے وہ دن، وہ بے چارگی وہ درد اُسے پھر تڑپانے لگے۔ اُسے آج بھی یاد تھا وہ دن جب وہ لوگ نئے نئے اُس محلے میں آئے تھے تو وہ بچوں کو کھیلتا دیکھ اُن کے ساتھ کھیلنے آ گیا۔ جب وہ اُس ٹولی میں کھیل میں مست تھا تو اچانک ایک لڑکی نے آ کر سب کو اُس کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیا۔ ''کوئی اس لنگڑے کے ساتھ نہیں کھیلے گا۔'' اور سبھی بچے اُسے ''لنگڑا لنگڑا'' کہہ کر چڑانے لگے۔ وہ روتا ہوا گھر واپس لوٹ آیا۔ اُس روز سے وہ صرف بالکونی میں بیٹھ کر بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتا۔ نیلا ان سب بچوں کی لیڈر تھی اور سب کو اپنے اشاروں پر نچاتی تھی۔ وہ تو کوئی پریوں کے دیش سے آئی ہوئی شہزادی تھی جس کی بات کا اُس نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ بس دل ہی دل میں اُن کے ساتھ کھیلنے کو ترستا رہتا اور سوچتا رہتا کہ کاش وہ بھی عام بچوں کی طرح ہوتا تو وہ بھی خوب مستی کرتا۔ یہی جذبہ دل میں بسائے اُس نے خوب محنت سے پڑھائی کی اور خود کو اس قابل بنا لیا کہ لوگ اُسے کسی سے کم نہ سمجھیں اور پھر جب وہ ایک قابل ڈاکٹر بن گیا تو اُسی شہزادی کے گھر پیغام بھجوا دیا جسے وہ بچپن سے چاہتا تھا، جس کے برابر آنے کے لیے اُسے اتنی محنت کرنی پڑی۔ مگر ایک بار پھر اُسے احساس دلا دیا گیا کہ وہ اب بھی اپاہج

ہے اور اُس دن کے بعد اُس نے قسم کھائی تھی کہ جتنا اُس کے بس میں ہوگا وہ بچوں کا اپاہج پن دُور کرنے میں اُن کی ضرور مدد کرے گا تاکہ کوئی بچّہ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہو۔ یہی اُس کی زندگی کا مقصد بن گیا۔

پانچ تاریخ کو صبح ہی سجل کا فون آ گیا کہ وہ آج گیارہ بجے ان لوگوں کو کلینک میں لا رہا ہے۔اور گیارہ بجنے سے پہلے وہ لوگ بچے کو لے کر وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر آنند نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا اور جیسے ہی بچے کو گود میں اُٹھانا چاہا تو مسز کانت کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک پل کے لیے وہ بھی ٹھٹھک گیا مگر خود کو جلد سنبھال لیا۔ سجل نے اُس کی نگاہ پہچان لی اور تعارف کرانے لگا۔

''یہ آپ کے ہی شہر کی رہنے والی ہیں۔ مسز کانت!''

نیلا کی آنکھیں جھک گئیں۔ اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اس طرح آنند سے اُس کی ملاقات ہوگی۔ اُسے وہ لمحے یاد آ گیا جب آنند کے گھر سے اُس کے لیے رشتہ آیا تھا تو اُس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ:

''میں کسی لنگڑے کی بیوی کہلانے سے مرنا زیادہ پسند کروں گی۔ اُس کی ہمت کیسے ہوئی میرے بارے میں سوچنے کی۔ پڑھا لکھا ہے تو کیا ہوا مجھے دے ہی کیا سکتا ہے۔''

اور آج وہ اُسی کے دروازے پر سوالی بن کر کھڑی تھی۔ اُس سے نظریں ملانے کی تاب اُس میں نہیں تھی۔

OO

کوکھ جلی

یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ مندر کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے مالتی دیوی کی نظر کلیانی پر پڑ گئی جو ایک کونے میں دیوار کا سہارا لیے دونوں گھٹنوں میں اپنا سر چھپائے رو رہی تھی۔ اجنبی ہاتھوں کا لمس کاندھوں پر محسوس ہوتے ہی وہ چونک اُٹھی۔ سامنے ایک بوڑھی عورت ہاتھ میں پوجا کی تھالی لیے کھڑی تھی۔ سفید ساڑھی، چاندی جیسے بال اور چہرہ جھرّیوں سے بھرا ہوا، کمر تھوڑی جھکی ہوئی مگر آنکھوں میں ممتا اور رحم کا جذبہ صاف نظر آرہا تھا۔ وہ وہیں زمین پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''کب سے بیٹھی ہو یہاں......؟''

''رات سے......''

''رات سے......کیوں......؟''

اس کیوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا...... ''تمھارا گھر کہاں ہے؟''

گھر کا خیال آتے ہی وہ زور زور سے پھر رونے لگی۔

''صبح صبح روتے نہیں، چلو، اُٹھو آؤ میرے ساتھ، مجھے سہارا دے کر اُٹھانا ذرا......''

نہ جانے کتنا اپنا پن تھا اس عورت کی باتوں میں، کلیانی جلدی سے اس کی مدد کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرے ساتھ چلو۔ یہ پکڑو پوجا کی تھالی۔''

اور وہ آگے آگے چل دی، مندر سے چند قدموں کی دوری پر اس عورت کا گھر تھا۔

''یہ آپ کا گھر ہے......؟''

''ہاں......''

''اتنا بڑا......''

''ہاں ......اندر آؤ، یہاں بیٹھو...... میرے پاس کرسی پر، اب بتاؤ تم رات سے مندر میں کیوں ہو؟ کہاں سے آئی ہو اور کیا بات ہے، گھبراؤ نہیں بیٹی، میں تمھاری ماں جیسی ہوں، مجھ سے اپنا غم بانٹ لو، شاید میں تمھاری کچھ مدد کر سکوں۔''

''میری مدد تو بھگوان نے بھی نہیں کی، اب اور کوئی کیا کرے گا۔''

''بھگوان ایک رستہ بند کرتا ہے تو دوسرا کھول بھی دیتا ہے۔ اپنا دُکھ مجھ سے بانٹ کر تو دیکھو۔''

''زمینداروں کی بہو بنی، بہت پیار ملا، بہت عزّت ملی، لوگ زمیندارنی جی کہہ کر بلاتے تھے، مگر دھیرے دھیرے پیار بھی چھن گیا، عزّت بھی ختم ہوگئی، کنگال کر دیا ان لوگوں نے۔ میرا قصور اتنا تھا کہ میں ان کو وارث نہ دے سکی، میں بانجھ ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

''یہ تو بھگوان کی لیلا ہے اس میں تیرا کیا قصور......؟''

''یہ تو آپ کہہ رہی ہیں، وہ لوگ تو ایسا نہیں سمجھتے، خاندان کو وارث نہ دینے کا جو گناہ میں نے کیا اس کی سزا مجھے سوت کے روپ میں ملی، میری محنت، میری خدمت کا کوئی مول نہ لگا سکے وہ لوگ۔ جب تک چپ چاپ سہتی رہی سب ٹھیک تھا۔ جس روز صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا میری زبان بھی چل نکلی۔ بس پھر کیا تھا، میری زبان نہ رُکی اور ان کے ہاتھ نہ تھکے۔ دوسری کے پاؤں جم گئے اور میرے اُکھڑ گئے۔ دھکّے مار کر گھر سے باہر نکال دیا۔ اتنی بڑی دُنیا میں کس سے مدد مانگتی۔ بس گھر چھوڑا تو اس کے در کے علاوہ اور کوئی ٹھکانا نظر نہیں آیا۔''

''ماں باپ نہیں ہیں کیا......؟''

''بیوہ ماں خود بھائی بھابی پر بوجھ ہے، ان پر کیا بوجھ بنتی۔''

''پڑھی لکھی ہو......؟''

''بس تھوڑا بہت۔''

''میرا گھر سنبھال لوگی؟'' یہ سنتے ہی وہ اس کے قدموں پر گر پڑی۔ اس دن سے ان دونوں میں ایک بہت ہی پیارا رشتہ قائم ہوگیا۔ اس نے نہ صرف مالتی دیوی کے گھر کو ہی سنوارا بلکہ مالتی دیوی کا بھی سہارا بن گئی۔ دراصل دونوں کو ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ اتنے بڑے گھر میں مالتی دیوی صرف ایک کتّے کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ انھیں بھی ایک ایسی عورت کی ضرورت تھی جو اُن کے گھر کو سنبھال سکے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر دو باتیں

کر سکے۔ وہ بھی دیواروں سے باتیں کرتے کرتے تھک چکی تھیں۔ اور پھر گھر سے نکالی گئی عورت، جس کا نہ کوئی ٹھکانا تھا، نہ پڑھی لکھی۔ اس کے لیے عزّت کی روٹی کمانا، اتنا آسان نہ تھا۔ یہ اتفاق ہی تو تھا کہ دونوں ایک دوسرے کو مل گئیں۔

یہاں شہر میں آکر اسے کام سیکھنے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی۔ مالتی دیوی اسے ہدایت دیتی جاتی اور وہ اسی طرح کام کرتی جاتی۔ دھیرے دھیرے اس نے سارا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ گاؤں میں تو اسے جم کر کام کرنا پڑتا تھا، ساس سسر کی دیکھ بھال اور دیورانی کے دو بچے یہ کام ہی اس کے لیے سب سے بڑے تھے۔ سارا دن ان کے کاموں میں الجھی رہتی۔ کبھی اس نے دیور کے بچوں کو بیگانا نہ سمجھا۔ ساس کو ماں سے کم نہیں۔ پورے پندرہ سال خدمت کی ساس سسر کی مگر جس وقت اس کا شوہر اسے دھکّے مار کر گھر سے نکال رہا تھا، اس وقت اس کی چھوٹی بہن جیسی دیورانی اپنے دونوں بچوں کو کمرے میں لے کر چلی گئی۔ بچّے زور زور سے اس کے پاس آنے کو چلاّ رہے تھے مگر انھیں بھی اس کھیل میں اپنی ماں سے مار کھانی پڑی۔ ساس سسر تو جیسے اندھے اور بہرے ہو گئے، نہ انھیں کچھ دِکھائی دے رہا تھا اور نہ سنائی۔ اس کے رونے چلاّنے کی آوازیں سن کر گھر کی دیواریں لرز اٹھیں مگر وہ خاموش رہے۔ گھر سے نکالے جانے کے بعد اس کے پاس جیسے جینے کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا مگر مالتی دیوی کی دیکھ بھال اور ان کے پیار نے اسے ایک نیا مقصد دے دیا تھا۔ اس کے پوچھنے سے پہلے ہی مالتی دیوی نے بتا دیا تھا کہ اس کے دو بہت لائق بیٹے ہیں، بہت پڑھے لکھے، اور خوب پیسہ کما رہے ہیں، اپنے ماں باپ کا نام روشن کر رہے ہیں، فون پر اکثر بات ہوتی رہتی ہے اور جب بھی فرصت ملتی ہے ماں سے ملنے چلے آتے ہیں۔

ایک دن مالتی دیوی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی تو ڈاکٹر کو گھر بلانا پڑا۔ ڈاکٹر شرما ان کے بڑے بیٹے ساحل کا بچپن کا دوست تھا۔ خبر ملتے ہی بھاگا چلا آیا۔ معائنہ کرنے کے بعد اس نے اپنی رائے دی۔

"آپ کو ساحل کو بلا لینا چاہیے کہیں پچھلی بار جیسی حالت نہ ہو جائے۔ آپ اگر کہیں تو میں اسے فون کر دیتا ہوں۔"

"نہیں نہیں اسے بلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کام کاج والے بچے کام چھوڑ کر میرے پاس بیٹھے رہیں یہ مجھے پسند نہیں ہے۔ پھر تم ہو اور اب تو کلیانی بھی ہے میری دیکھ بھال

کے لیے۔" اس نے پاس کھڑی کلیانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی تعریف......؟"

"یہ میری بہن کی بیٹی ہے تو میری بیٹی بھی ہوئی نا......"

یہ سنتے ہی کلیانی کی آنکھیں بھر آئیں، خود کو جھٹ سے سنبھال کر ڈاکٹر سے دوائیوں کے بارے میں سمجھنے لگی۔

"آپ بالکل بے فکر رہیں ڈاکٹر صاحب! میرے ہوتے ہوئے ماں کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر شرما اسے سب سمجھا کر چلے گئے۔

اس روز سے اس نے انھیں ماں کہہ کر بلانا شروع کر دیا۔

دس بارہ روز تک ماں بستر سے ہلنے کے لائق بھی نہ تھی۔ کلیانی نے ان کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دِیے سارا دن ان کے آس پاس رہتی اور رات کو انھیں کے کمرے میں سوتی۔ جب کبھی بھی ماں نے کروٹ بدلی اسے جاگتے ہوئے پایا۔

"میرے ساتھ تو اپنا خیال بھی رکھ، کہیں خود بیمار نہ پڑ جانا۔"

"بہت سخت جان ہوں ماں! اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی زندہ ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہونے والا۔"

جب سے ماں بستر پر پڑی تھی اس روز سے اس نے بیٹوں کی باتیں زیادہ کرنی شروع کر دی تھیں۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ ان کا بڑا بیٹا لندن میں رہتا ہے، اس کا اپنا کاروبار ہے، اور دو بچے بھی ہیں، اس کی بیوی بھی اس کے کاروبار میں اس کی مدد کرتی ہے، خوب پیسہ کما رہے ہیں، اور ہمیشہ کے لیے وہیں رہنا چاہتے ہیں۔

چھوٹا بیٹا سدیش بنگلور میں ایک ودیشی کمپنی میں انجینئر ہے۔ اس کی بیوی ڈاکٹر ہے اور اس کا خود کا کلینک ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے اور دوسرا بچہ پیدا کرنے کی ان کے پاس فرصت نہیں ہے۔ جب کبھی بھی انھیں فرصت ملتی ہے ماں سے ملنے چلے آتے ہیں۔

مگر اتنے روز دن رات ماں کے ساتھ رہنے پر بھی جب کلیانی نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں سے کسی کا بھی فون نہیں آیا تو اس سے رہا نہ گیا۔

"ماں کئی روز ہو گئے ہیں مجھے آپ کے یہاں آئے ہوئے۔ مگر دونوں میں سے کسی کا بھی فون نہیں سنا۔"

اس دن شام کو ہی تو آیا تھا دونوں کا فون، جب تم ڈاکٹر کے پاس دوا لینے گئی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں تمھارے بارے میں بتا دیا بہت خوش ہوئے، اور پھر میں نے انھیں اپنی طبیعت کے بارے میں جھوٹ بول دیا کہ میں ٹھیک ہوں۔''

''یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔''

''اگر کہہ دیتی کہ طبیعت خراب ہے تو وہ دونوں بھاگے چلے آتے، پھر مجھے ساتھ لے جانے کی ضد کرتے۔''

''ٹھیک ہی تو ہے، آپ کو اس عمر میں ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔''

''بالکل غلط، یہ گھر چھوڑ کر میں کہیں نہیں رہ سکتی۔ تجھے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ مجھے اس گھر سے کتنا لگاؤ ہے۔ اسی گھر میں میں دُلہن بن کر آئی۔ اسی گھر میں مجھے ماں بننے کی سعادت ملی۔ ان کا بچپن یہاں گزرا، دونوں کی شرارتیں، ان کے ابّو کا پیار سب کچھ تو ہے ان دیواروں میں۔ بہت کچھ پایا اور بہت کچھ کھویا بھی، یہاں کے در و دیوار میرے سکھ دکھ کے ساتھی ہیں۔ بہت سی کھٹی میٹھی یادیں وابستہ ہیں اس گھر کے ساتھ۔ اس گھر کو چھوڑ کر بھلا کیسے جا سکتی ہوں۔''

''آپ کا دل نہیں گھبراتا اکیلے میں......؟''

''اب نہیں گھبراتا......میری بیٹی جو میرے ساتھ ہے۔''

بیٹی کی خدمت رنگ لائی اور وہ پھر سے چلنے پھرنے لگیں، ڈاکٹر شرما حیران بھی تھے اور خوش بھی۔

''آپ نے تو کمال کر دیا، پچھلی بار جب ان کو اس طرح کا دورہ پڑا تھا تو بہت وقت لگ گیا تھا ان کو تندرست ہونے میں......ایک نرس پورے دو مہینے دن رات ان کے ساتھ رہی۔''

''وہ نرس تھی یہ بیٹی ہے۔'' ماں نے فخر کے ساتھ کہا۔

دونوں کے دن اچھے گزر رہے تھے۔ ماں جب بھی اسے اُداس یا کھویا ہوا دیکھتی تو اسے پاس بٹھا کر اس سے اس کے ماضی کی باتیں پوچھتی تا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور پھر باتوں باتوں میں بیٹوں کے بچپن کے قصّے شروع ہو جاتے۔ کلیانی کہانیاں سن سن کر مسکراتی رہتی مگر دل میں ایک دھیمی سی کسک محسوس کرتی۔ سوچتی کہ کتنا بڑا ذخیرہ ہے ماں کے پاس بچوں کی یادوں کا اور اس کا دامن تو بالکل خالی ہے۔ وہ کس کے سہارے زندگی گزارے گی۔

''تم یہ اچانک کہاں کھو جاتی ہو؟''

''کہیں بھی تو نہیں ماں......بس اتنا سوچتی ہوں کہ کتنی خوش نصیب ہیں آپ۔''

''وہ کیسے......؟''

''دو دو بیٹے دِیے ہیں بھگوان نے آپ کو۔''

''ایک بیٹی بھی تو دی ہے......اس کے بارے میں کچھ کیوں نہیں کہتیں۔''

''یہ تو آپ کا بڑا پن ہے ماں، جو مجھ جیسی بدنصیب اور بے سہارا کو آپ نے اپنا لیا اور جینے کا مقصد دیا۔''

''خبردار......آج کے بعد خود کو بدنصیب یا بے سہارا کہا، یہ تو بھگوان جانتا ہے کون کس کا سہارا ہے۔''

دھیرے دھیرے بستر چھوڑنے کے بعد کلیانی نے ماں کو پہلے گھر کے اندر پھر باہر باغیچے میں ہاتھ پکڑ کر ٹہلانا شروع کروایا اور پھر ایک روز گھر سے باہر ٹہلانے لے گئی۔ بچوں کی طرح ان کا ہاتھ تھامے دھیرے دھیرے چہل قدمی کرواتی رہی۔ دور کچھ لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ماں سڑک کے کنارے رُک گئی، لگتا تھا کوئی حادثہ ہو گیا ہے، دیکھا تو پولیس بھی کھڑی ہے، کرین بھی ہے اور یہ بڑی بڑی گاڑیاں......

''بیٹا سنو تو، یہاں اتنے لوگ کیوں جمع ہوئے ہیں؟'' کلیانی نے راہ جاتے ایک نوجوان کو روک کر پوچھا۔

''کل سے ایک گائے کا بچہ اس سڑک پر چکر کاٹ رہا تھا۔ نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا، بس اتنی سی جگہ پر چکّر پر چکّر کاٹتا رہا۔ کسی بزرگ نے جب اس کی یہ حالت دیکھی تو اس نے کچھ لوگوں کو دیکھنے کے لیے بھیجا کہ معاملہ دیکھ کر آؤ، کچھ بات ضرور ہے۔ اچھی طرح دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں گہرے گڑھے میں گائے گری پڑی تھی۔ جلدی سے پولیس بلائی، کرین آئی، ایمبولینس آئی اور پھر ان لوگوں نے رسّا ڈال کر اسے باہر نکال لیا۔ اب اسے گاڑی میں ڈال رہے ہیں۔''

''وہ زندہ ہے یا مر گئی......؟'' ماں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

''بالکل زندہ ہے، اگر گائے کا بچھڑا وہاں چکّر نہ لگاتا تو کسی کو گائے کا پتہ ہی نہ چلتا۔'' یہ کہہ کر لڑکا تو چلا گیا مگر ماں زور زور سے رونے لگی۔ کلیانی حیران تھی کہ ماں کو کیا ہو گیا۔

''ماں چپ ہو جا، اب گائے تو بالکل ٹھیک ہے۔''

مگر ماں کی سسکیاں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔

''ماں خود کو سنبھالیے، دیکھیے ایک ماں کی جان اس کے بچے کی وجہ سے بچ گئی۔ دو دن گڑھے میں گرے رہنے پر بھی وہ زندہ ہے۔ کتنا بڑا کرشمہ ہے۔''

''کاش میں بھی گائے ہوتی......'' ماں روتے روتے بولی۔

وہ حیرت سے ماں کو دیکھ رہی تھی۔ آج سے پہلے اس نے ماں کا یہ روپ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ تو یہ سمجھتی رہی کہ وہ ایک بہت مضبوط عورت ہے۔

''ماں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں......؟''

''میں اتنے دنوں تجھ سے جھوٹ بولتی رہی پچھلے پانچ سالوں میں سُدیش صرف ایک بار آیا ہے اور فون تو چار مہینے پہلے کیا ہوگا، اور بڑے والے کی شکل تو میں نے اس کے باپ کے انتقال کے وقت دیکھی تھی، پورے آٹھ برس ہو گئے انھیں گزرے ہوئے۔ بس فون کر کے اپنا فرض پورا کر دیتا ہے۔ ان کے پاس میرے لیے پیسہ تو بہت ہے پر وقت نہیں ہے۔ میں زندہ رہوں یا نہ رہوں انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تو بہت خوش نصیب ہے کہ تو بے اولاد ہے۔ کاش میں بھی بانجھ ہوتی۔''

OO

مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں

یہ پہلی بار نہیں ہے کہ جی میں آیا ہے کہ گھر بار چھوڑ کر کہیں دُور نکل جاؤں کسی ایسی جگہ جہاں کوئی تنگ کرنے نہ آسکے۔ نہ میں کسی کی صورت دیکھوں اور نہ کسی سے بات کروں۔ نہ روزی روٹی کی فکر ہو، نہ کوئی ضرورت، نہ کوئی خواہش، نہ تمنا، بس ایک جوگی کا جیون ہو۔ کھانے کو کچھ مل جائے تو ٹھیک نہ ملے تو کوئی غم نہیں۔ ضرورت ہے تو صرف چارسُو خاموش فضا اور پُرسکون ماحول کی تا کہ بوجھل جسم، تھکے ہارے دل ودماغ اور چھلنی روح کو مکمل قرار مل سکے۔ اس بھاگتی ہوئی زندگی کی رفتار تھم جائے یا پھر خودکشی کر کے زندگی کا قصہ ہی ختم کر دیا جائے۔ مگر میں ایسا کیوں سوچتا ہوں۔ خودکشی کے بارے میں تو کمزور، کم ظرف لوگ سوچتے ہیں۔ مگر میں بھی تو کمزور اور ناکام انسان ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھ سے میری زندگی کی بیش قیمتی چیز یعنی میری پہلی اور آخری محبت نلنی جدا نہ ہوتی۔ اب تو زندگی ایک تماشہ بن کر رہ گئی ہے۔ ایسے جینے کو زندگی تو نہیں کہا جا سکتا۔ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح کام کرو اور ساتھ میں افسر کی ڈانٹ پھٹکار سنو۔ ڈانٹتے وقت افسر ایسے سمجھتا ہے کہ وہ کسی انسان سے نہیں بلکہ جانور سے مخاطب ہے۔ اتنی ذلت سہنے کے بعد بھی زبان نہیں ہلتی۔ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتا ہوں۔ مجبوری انسان سے کیا کچھ نہیں کراتی۔ بہت مشکل سے تو ہاتھ لگی ہے یہ نوکری اور اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گئی تو روٹی کے لالے پڑ جائیں گے۔ ویسے بھی اس تنخواہ میں بچوں کی ضرورتیں کہاں پوری کر پاتا ہوں۔ ساری عمر پڑھائی میں غرق کر کے بھی دو وقت عزت کی روٹی بہت مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔ شام کو تھکے ماندے گھر لوٹو تو بیوی بچوں کی مانگیں منہ کھولے کھڑی ہوتی ہیں۔ اُس وقت بچوں کی شرارتیں، اُن کی ہنسی بھی اچھی نہیں لگتی۔ اُن کو کیا معلوم کہ اُن کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے مجھے دن میں کتنی بار مرنا پڑتا ہے۔ اس گھر گرہستی کے جنجال میں پھنس کر اپنا وجود کھو بیٹھا ہوں۔ میں بھول گیا ہوں کہ اس جسم کے اندر کبھی ایک دل دھڑکتا تھا، کچھ

حسین خواب پلتے تھے، کچھ رنگین ارمان مچلتے تھے۔ تب زندگی بہت خوبصورت لگتی تھی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ماں باپ کی سرپرستی نصیب تھی۔ پڑھائی اور عیش پرستی کے علاوہ کوئی اور کام نہ تھا۔ زندگی کی تلخ حقیقت سے بے خبر ایک الگ دُنیا میں رہتے تھے۔

زندگی کا پہلا جھٹکا اُس روز لگا جب اپنی پہلی محبت کو ہاتھوں سے پھسلتے دیکھا۔ جس روز نلنی نے آکر بتایا کہ اُس کی شادی کسی بینک منیجر سے ہونے جا رہی ہے۔ تو یہ سن کر میں بوکھلا اُٹھا۔

''تم شادی کیسے کر سکتی ہو؟ تم نے تو زندگی بھر میرا ساتھ نبھانے کی قسم کھائی ہے۔''

''میں مجبور ہوں روی، میں کیا کروں۔ میرے ماں باپ تم سے شادی کے لیے کبھی راضی نہیں ہوں گے۔''

''کیا کمی ہے مجھ میں؟ پڑھا لکھا ہوں، دیکھنے میں بھی اچھا ہوں۔ گھر بار اچھا ہے۔ پھر راضی کیوں نہیں ہوں گے؟''

''ایک بات بھول رہے ہو...... تم بیکار ہو۔'' اُس نے نگاہیں نیچے کیے ہوئے جواب دیا۔

''ہمیشہ تو بیکار نہیں رہوں گا۔ تم تو جانتی ہو، ہمیشہ فرسٹ کلاس میں پاس ہوا ہوں۔ نوکری بھی مل جائے گی۔ تم ان سے ایک بار بات تو کر کے دیکھو۔'' میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''اگر تمھیں دو سال نوکری نہ ملی تو کیا وہ انتظار کرتے رہیں گے؟''

''اُن کی چھوڑو۔ مجھے تو لگتا ہے تم بھی انتظار کرنا نہیں چاہتی۔ بینک افسر دیکھ کر تمھارا پیار ڈگمگا گیا ہے۔'' ایک جھٹکے سے میں نے اُس کا ہاتھ آزاد کر دیا۔

میری بات کا اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''میں زندگی میں تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے شاید میں دوبارہ کسی پر اس طرح بھروسہ نہ کر سکوں۔''

اُس کی آنکھوں سے ڈھلکتے آنسوؤں کو نظر انداز کر میں وہاں سے چلا آیا۔ پیار، اعتماد، جذبات، خوشیاں سب کچھ وہیں پر چھوٹ گیا۔ میرے ساتھ آئی تو زندگی کی تلخ حقیقت، مایوسی، ویرانی۔

میں سمجھا تھا کہ نلنی کو کھو دینے سے بڑا غم اور کیا ہو سکتا ہے۔ اُس کے چلے جانے سے میں ٹوٹ کر بکھر جاؤں گا مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کے برعکس میری قوتِ برداشت میں اور اضافہ

ہو گیا۔نوکری کے لیے ٹھوکروں نے سمجھا دیا کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

زندگی کی گرد و پیش میں کئی زخم ہے۔آنکھ موند کر ماں کی مرضی، اُس کی پسند کو قبول کر لیا مگر دِل میں بسی نلنی کی جگہ آرتی کو نہ دے سکا۔ میں آرتی میں نلنی کو تلاش کرتا رہا۔ جب مایوس ہو جاتا تو بے وجہ اُس سے الجھ پڑتا۔ میرا غصہ، میری جھنجھلاہٹ دیکھ کر وہ خاموش ہو جاتی۔ اُس کی خاموشی اور رونی صورت مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتی کہ مجھے کیا حق ہے اس طرح اس غریب پر بگڑنے کا جسے نہ میں پیار دے سکا اور نہ ہی زندگی کے عیش و آرام اور پھر جس کا کبھی اُس نے بھولے سے بھی گِلہ نہیں کیا۔

شام جب میں تھکا ماندہ دفتر سے گھر لوٹا تو دونوں بچّے دوسرے کمرے میں پڑھ رہے تھے۔آرتی جلدی سے چائے لے آئی اور پاس بیٹھ گئی۔ کچھ دیر خاموش میری حالت کا جائزہ لیتی رہی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''میں نے اس سے پہلے کبھی اُسے اس طرح دیکھتے نہیں دیکھا تھا۔

''آپ کی حالت دیکھ رہی ہوں۔''

''کیا ہوا ہے میری حالت کو؟''

''سر سے پیر تک پریشان نظر آرہے ہیں۔ کیا آپ اپنی تکلیف، اپنے غم مجھ سے نہیں بانٹ سکتے؟''

''تم کیا کر سکتی ہو؟''

''میں آپ کا ہاتھ بٹا سکتی ہوں۔آپ کے کندھوں پر جو گرہستی کا بوجھ ہے اُسے کم کر سکتی ہوں۔''

''کیسے؟''

''نوکری کر کے۔''

''تمھیں باہر کی دُنیا کا کچھ علم ہے؟ کبھی گھر سے باہر نکل کر دیکھو زمانہ کہاں جا رہا ہے۔''

''میں گھر میں رہ کر بھی تو کام کر سکتی ہوں۔شادی سے پہلے بھی میں کپڑوں کی سلائی کرتی تھی۔اب بھی کر سکتی ہوں۔وقت بھی گزر جائے گا اور چار پیسے بھی آجائیں گے۔''

''رہنے دو رہنے۔دو تم صرف بچوں کو سنبھال لو۔ابھی اتنے بھی بُرے دن نہیں آئے کہ تمھاری کمائی سے گھر چلے۔''

''آپ تو بہت دقیانوسی بات کر رہے ہیں۔ میں گھر پر رہتی ہوں مگر آپ تو باہر جاتے ہیں۔ وہ کون سی جگہ ہے، وہ کون سا محکمہ ہے جہاں عورتیں کام نہیں کرتیں۔''

آج پہلی بار میں اُسے اس طرح بحث کرتے دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے یہ زبان لڑانے والی اُس کی بات بہت ناگوار گزری۔ اور میں نے جھٹ سے وار کر دیا۔

''وہ پڑھی لکھی عورتیں ہیں، تم جیسی جاہل نہیں۔''

''آپ تو پڑھے لکھے ہیں پھر بھی ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ تعجب ہے۔''

بہت دھیمے سے یہ بات کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں سر تا پا جل گیا۔ میری مردانگی میری انا یہ ٹھیس کیسے برداشت کرتی؟ غصّے سے تلملاتا ہوا میں گھر سے باہر نکل آیا۔ جی میں آیا کہ اب واپس کبھی اُس گھر میں لوٹ کر نہ جاؤں، کہیں دُور نکل جاؤں یا خودکشی کر کے یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دوں۔ دل و دماغ میں اُٹھتے ہوئے طوفان سہتا رہا اور بے مقصد بے ارادہ نہ جانے گھر سے کتنی دُور نکل آیا۔ شام ڈھل چکی تھی اور چاروں طرف اندھیرا اپنی چادر پھیلا رہا تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوائیں چلنی شروع ہو چکی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ان ہواؤں نے آندھی کا روپ اختیار کر لیا تھا۔ آگے سنسان ویران راستہ دیکھ کر میرے قدم خود بخود گھر کی طرف لوٹ آئے۔ دروازے پر آرتی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی چین کی سانس لی اور بنا کچھ کہے اندر چلی گئی۔

بہت مشکل سے ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ کسی نے زور سے شانے جھٹکا کر اٹھا دیا۔ آنکھ کھلی تو ایک دُھندلا سا سایہ نظر آیا۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو سامنے سفید لباس پہنے ایک آدمی نظر آیا جس کے چہرے سے نور ٹپک رہا تھا اور جس کی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے میرے پورے وجود نے سکون محسوس کیا۔ میں نے اُٹھ کر بجلی جلانے کی کوشش کی تو ہلنا بھی محال لگا۔ نظریں گھما کر دیکھا تو پاس آرتی دونوں بچوّں کو اپنے اِرد گرد چپکائے گہری نیند سو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بول پاتا۔ اُس آدمی کی آواز کسی گہری کھائی سے آتی ہوئی میرے کانوں میں پڑی۔

''چلو چلنے کا وقت ہو گیا۔''

''کہاں؟''

''اُس دُنیا میں جہاں تم ہمیشہ سے جانا چاہتے تھے، جس کی ہمیشہ تم دُعا کرتے تھے۔ جہاں کوئی غم نہیں ہوتا کوئی فکر نہیں ہوتی۔''

''ایسی کوئی جگہ ہے؟''

''بالکل ہے۔اس دُنیا سے دُور بہت دُور۔''

''کتنے دن کے لیے جانا ہوگا؟''

''ہمیشہ کے لیے۔''

''ہمیشہ کے لیے؟ وہ کیوں؟''

''کیونکہ وہاں سے کوئی لوٹ کرنہیں آتا اور تم ہمیشہ سے یہی تو دُعا کرتے تھے کہ بھگوان مجھے اس غم سے نجات دلا، مجھے اپنے پاس بلا لے۔اب چلو چلنے کا وقت آ گیا۔''

''مگر میری بیوی بچّے؟''

''وہ یہیں رہیں گے۔''

''اُن کا کیا ہوگا؟ میرے بچّے تو بہت چھوٹے ہیں اُن کی پرورش کون کرے گا؟''

''اُن کی ماں کرے گی۔''

''مگر وہ تو پڑھی لکھی بھی نہیں ہے اور نہ اُسے دُنیاداری نبھانی آتی ہے وہ کیا کر سکتی ہے؟''

''تم فکر کیوں کرتے ہو۔وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے۔وہ بھی سیکھ جائے گی۔تم اُٹھو میرے ساتھ چلو۔''

''اچھا میں چل پڑوں گا تمھارے ساتھ مگر مجھے کچھ وقت تو دو۔میں ان کا کچھ انتظام تو کر دوں۔اُنھیں اس قابل تو بنا دوں کہ وہ آرام سے اپنا گزارا کر سکیں۔ابھی تو اُنھوں نے زندگی میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔'' میں نے اپنے معصوم بچّوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو آنے والے طوفان سے بے خبر چین کی نیند سو رہے تھے۔

''کیا دکھا رہے ہو تم انھیں اور کیا دکھا سکتے ہو۔تمھارے پاس ڈانٹ، غصّے اور مایوسی کے علاوہ ہے ہی کیا؟ آج تک کبھی بھولے سے بھی اپنے بچّوں کو سینے سے لگایا ہے؟ کبھی اُن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا ہے؟ کبھی اپنی بیوی سے ہنس کر دو باتیں کی ہیں؟ کبھی کوئی خوشی دی ہے اُنھیں؟ تم تو ہمیشہ اپنے بارے میں سوچتے رہے ہو۔تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمھیں کیا ملا ہے۔تم نے کیا پایا ہے۔تم تو ہمیشہ یہی روتے رہے کہ تم نے زندگی میں کیا کھویا ہے کیا...... تم حاصل نہیں کر پائے، ایک بات کہوں تم سے؟''

''ہاں کہو؟''

''جو زندگی وہ جی رہے ہیں، تمھارے بغیر، اُس سے بہتر زندگی گزاریں گے اور بہت جلد تمھیں بھول جائیں گے۔ تم اُن کی فکر چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔''

''مگر میں تو ابھی جینا چاہتا ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔''

''کیسے آدمی ہو ہر وقت مرنے کی دُعا مانگتے ہو اور جب میں لینے آیا ہوں تو جانے سے انکار کر رہے ہو۔ چلو جلدی کرو، صبح سے پہلے ہمیں بہت دُور پہنچنا ہے۔''

اس نے جھک کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

میں پھر سے گڑگڑانے لگا۔ اُس کے پیروں سے لپٹ گیا۔

''اس بار مجھے معاف کر دو۔ مجھے بخش دو۔ مجھے مت لے کر جاؤ۔ مجھے معاف کر دو......''

''تمھارے بچوّں پر رحم آ رہا ہے اس لیے ایک موقع اور دیتا ہوں۔ اس بار تو خالی ہاتھ جا رہا ہوں مگر میں پھر آؤں گا۔''

اور وہ سایا اچانک ہوا میں غائب ہو گیا۔ اُس کے جاتے ہی خود بخود میری آنکھیں کھل گئیں اور جسم میں حرارت بھی شروع ہو گئی۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرا پورا جسم پسینے سے لت پت تھا اور ایسے ٹوٹ رہا تھا جیسے بہت مشقّت کی ہو۔ آرتی اور بچےّ اب بھی گہری نیند سو رہے تھے۔ میں پلنگ کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ ایک ایک بات ذہن نے دوہرائی۔ ایک پل کے لیے سوچا شاید خواب تھا مگر دل اس بات کو ماننے کو تیاّر نہ تھا۔ یہ خواب نہ تھا ایک حقیقت تھی۔ میں آج موت سے دو چار ہوا تھا۔ موت کو سامنے دیکھا تو زندگی کی قیمت کا احساس ہوا۔ آج تک تو صرف زندگی سزا کی طرح کاٹ رہا تھا مگر نہ جانے کب وہ موت کا فرشتہ دوبارہ دروازے پر دستک دے دے۔ نہ جانے کتنے دنوں کی یا پھر کتنے سالوں کی مہلت دے کر گیا ہے؟ مجھے اس مہلت کا پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ ابھی تو مجھے بہت سے ادھورے کام پورے کرنے ہیں۔ بچوّں کا مستقبل سنوارنا ہے۔ آرتی کا دامن خوشیوں سے بھرنا ہے اُسے وہ پیار دینا ہے جس کی وہ حق دار ہے۔ اُسے کام بھی تو شروع کرا کر دینا ہے۔ پھر اس کے بعد میرا دماغ تیز رفتار سے کس کس راستے سے گزرتا رہا۔ نیند آنکھوں سے میلوں دُور تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے رات کا اندھیرا چھٹ گیا اور صبح کی صاف شفاف روشنی چاروں طرف پھیل گئی۔

OO

ہواؤں کا چلن

دس سال پہلے جب میں شادی کرا کے پربھات کے ساتھ پہلی بار وطن چھوڑ کر گئی تھی تو اس وقت دل میں ایک عجیب سی اُمنگ تھی۔ اپنوں سے دُور ہو جانے کا غم تو تھا مگر مغرب کی کشش سے زیادہ نہ تھا۔ کینیڈا کے بارے میں اتنی باتیں سن رکھی تھیں کہ بہت خوبصورت جگہ ہے، آبادی بہت کم ہے، ہریالی بہت ہے اور پھر لوگ معیاری زندگی گزارتے ہیں۔ جو لوگ ایک بار وہاں گئے، وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کے مطابق تو ہندوستان میں لوگ کیڑے مکوڑوں کی زندگی گزارتے ہیں۔ مگر آج جب میں واپس وطن لوٹ رہی تھی تو دل میں خوشی کے ساتھ ساتھ میٹھی میٹھی کسک بھی تھی۔ اپنوں سے جدا رہ کر اُن کی محبت کا اندازہ ہو سکا تھا۔ ان دس برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ کئی اپنے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے تھے اور کئی نئے چہرے خاندان میں شامل ہو چکے تھے۔ نہ جانے والوں کو الوداع اور نہ آنے والوں کا استقبال۔ بس خبر ملی اور ہم اظہارِ افسوس یا اظہارِ خوشی کے علاوہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

دس سال بہت خوبصورتی سے گزر گئے۔ کام بھی بہت کیا اور عیش بھی بہت کی۔ ہم دو سے چار ہو گئے مگر دل میں اپنوں سے دُوری ہمیشہ درد جگاتی رہی۔ بچے تو کینیڈا کو ہی اپنا ملک سمجھتے تھے مگر کوئی یہ میرے دل سے پوچھتا کہ اپنے ملک کی فضا کیسی ہوتی ہے، اُس کی مٹی اور ہوا میں کیا جادو ہوتا ہے۔

ایک مدّت کے بعد اپنے لوگوں میں جا رہی تھی۔ وہاں کی گلیاں، وہاں کے لوگ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ شادی کے بعد یہ میرا دوسرا چکّر تھا۔ پہلی مرتبہ شادی کے دو سال بعد آنا ہوا۔ جب ابوّ کی بیماری کی خبر کپور انکل سے ملی تھی۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہی تو تھی۔ یہ تو کپور خاندان کی محبت تھی جنھوں نے میری غیر موجودگی میں اُن کا پورا خیال رکھا۔ اگر وہ وقت پر ابوّ کو اسپتال نہ لے جاتے تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ مجھے

تو یاد بھی نہیں کہ اس خاندان کے ساتھ ہمارے تعلقات کب سے ہیں۔ مجھے تو بس اتنا یاد ہے کہ مجھے بہن بھائیوں کا پیار ان لوگوں سے ہی ملا۔ پریتی اور میں نے ہم عمر اور ہمسایہ ہونے کی وجہ سے بہت وقت ایک ساتھ گزارا۔ بچپن کی شرارتوں سے لے کر جوانی تک کی کہانیوں کے لمحے ہم دونوں نے ایک ساتھ گزارے۔ وہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس لیے بہت خود پسند بلکہ ضدی تھی۔ گھر کا کوئی فرد اُس پر غصہ نہیں ہوسکتا تھا۔ منہ سے بات وہ بعد میں نکالتی تھی، پوری پہلے ہو جاتی تھی۔ گھر کا کام ماں خود کرتی تھی اور باہر کے کام بھائی انجام دیتے تھے۔ اس کے برعکس میری پرورش لڑکوں کی طرح ہوئی۔ جس زمانے میں لڑکیاں شام کو تنہا گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھیں، میرے ابوّ نے مجھے اسکوٹر لے دیا تھا۔ شام ہو یا رات، مجھے اکیلے گھر سے باہر جانے میں کوئی پرہیز نہیں تھا۔ کپور انکل ابوّ سے ناراض ہو جاتے۔

''زمانہ خراب ہے اور تم لڑکی کو اکیلے باہر بھیج دیتے ہو۔ کیا وِجے اور اجے تمھارے بیٹے نہیں؟ اگر کبھی کوئی تمھارے کام کو منع کرے تو کہنا۔''

ابوّ جواب دیتے۔ ''کپور صاحب، بات ایک دو روز کی ہوتی تو ٹھیک تھی مگر یہ تو زندگی بھر کا سوال ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی کو کسی بھی کام کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت پڑے۔ اسے سب کام خود کرنا آنے چاہئیں۔ اسے دُنیا کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں آپ پریتی کو بھی کچھ بڑی ہونے کا موقع دیں۔''

کپور انکل ہنستے ہوئے جواب دیتے۔ ''وہ دُنیا کا کیا مقابلہ کرے گی۔ وہ تو چھپکلی اور کاکروچ سے ڈر جاتی ہے۔''

پریتی کے بارے میں یہ بات بہت مشہور تھی کہ وہ ایک نمبر کی ڈرپوک ہے۔ اندھیرے سے اسے خوف آتا تھا۔ جب بھی شام کے وقت گھر سے مجبوری میں نکلنا پڑتا تو سڑک پر اس طرح سہمی سہمی چلتی جیسے کوئی پیچھے سے آ کر اسے دبوچ ہی لے گا۔ گھر پر تنہا بھی وہ رہ نہیں سکتی تھی۔ اگر کسی وجہ سے سبھی کو کہیں جانا پڑ جاتا تو یا تو وہ خود ہمارے گھر چلی آتی ورنہ مجھے اپنے گھر بلا لیتی۔ اکیلے پن سے اسے وحشت ہونے لگتی تھی۔ اگر اتفاق سے جان پہچان کا کوئی لڑکا سڑک پر مجھے مل جاتا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتیں۔ دھیرے سے پاس آ کر ہاتھ دبا کر چلنے کا اشارہ کر دیتی۔

''تم کسی سے بات بھی نہیں کرنے دیتیں۔''

''اگر اجے بھائی آجاتے تو غضب ہو جاتا۔''

''کیا وہ منہ میں ڈال رہا تھا تم کو؟''

''نہیں مگر بھائی کہتے ہیں کہ اجنبی لڑکوں سے بات نہیں کرنا چاہیے۔''

''اب تم بڑی ہو گئی ہو پریتی۔ اپنے دماغ سے سوچنا سیکھو۔ ہر وقت بھائی یہ کہتے ہیں، بھائی وہ کہتے ہیں۔ ساری عمر اُن کا ہاتھ پکڑ کر چلو گی کیا؟''

''اب بس بھی کرو۔ جب موقع ملتا ہے، لیکچر پلانا شروع کر دیتی ہو۔ یہ سب چھوڑو اور بتاؤ کہ تمھارا پربھات اور کیا کہتا ہے؟''

اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پربھات کا ذکر آتے ہی میرا لہجہ نرم پڑ جاتا ہے اور دماغ کی رگیں ایک دم ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ چہرہ خود بخود کھل اُٹھتا ہے۔ پھر ایسی باتیں شروع ہوتی ہیں کہ وقت کا احساس نہیں رہتا۔

پربھات ابوّ کے دوست کا بیٹا تھا جو دہلی میں انجینئرنگ کر رہا تھا۔ پہلے دن سے ہم ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ کب ہماری دوستی پیار میں بدل گئی، ہمیں معلوم ہی نہ ہوا۔ ہم سے پہلے ہمارے والدین ہماری محبت سے واقف ہو گئے تھے۔ جب ہم دونوں ساتھ ہوتے تو ہمیں کسی تیسرے کی موجودگی کا احساس نہ رہتا۔ جب پربھات دو تین دن نہ آتا تو میں کھوئی کھوئی رہتی اور اس کے ملتے ہی چہرہ کھل اُٹھتا۔ شاید اِنھی باتوں سے ہمارے دل کا حال گھر والوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ ان کو ہمارے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بہت جلد پربھات کے گھر تک بھی یہ اطلاع پہنچا دی گئی۔ پھر کیا تھا، دوستی کو رشتے داری میں بدلنے کے لیے پروگرام بننے لگے تھے۔

ایک شام پربھات اپنے جگری دوست سلیل کو ہمارے یہاں مجھ سے ملوانے لے کر آ ہی رہا تھا کہ کپور انکل کے گھر سے زوردار چیخوں کی آواز سن کر دونوں اسی طرف لپکے۔ دروازہ کھولا تو سامنے صوفے پر کھڑی پریتی چلا رہی تھی۔ دوپٹہ کہیں، خود کہیں۔ خوف سے چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ دونوں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ پریتی نے انھیں دیکھ کر تھوڑی سی راحت محسوس کی اور زمین کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ اس سے ڈر رہی ہے۔'' پربھات نے ہنستے ہوئے کہا اور دو بار زمین پر زور سے پیر مارا تو ڈر کر چھپکلی کہیں بھاگ گئی۔

دونوں دوست مارے ہنسی کے دوہرے ہوتے ہوئے گھر سے باہر نکل آئے اور آتے ہی شروع ہو گئے۔

''تم بھی کیسی دوست ہو مایا جو دوست کی چیخوں کی آواز سن کر بھی اپنے گھر آرام سے بیٹھی ہو!''

''آپ کے لیے یہ بات عجیب تھی۔ میں تو یہ بچپن سے سنتی آ رہی ہوں۔''

''معاف کرنا، آپ کا تعارف تو ہو گیا۔ اگر دوست اتنی بہادر ہے تو آپ بھی کچھ کم نہیں ہوسکتیں۔'' سلیل نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا اور بات ختم ہوگئی۔

اِدھر ہمارا عشق پورے شباب پر تھا اور اُدھر اُن کے پیار کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور جب سلیل نے زبان سے بات کرنا چاہی تو پریتی ڈر کر سمٹ گئی۔ سلیل کہاں ہار ماننے والا تھا۔ اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور جب ناکام ہو جاتا تو جھنجھلا اُٹھتا۔

''آپ بھی کیسی دوست ہیں۔ کیا اپنے جیسا نہیں بنا سکتیں تھیں پریتی کو۔ جب بھی بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں، تب بھاگ جاتی ہے یا بات بدل دیتی ہے۔''

''دراصل وہ گھر میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے سب کی آنکھوں کا نور ہے۔ ایک ایسے خزانے کی طرح جسے وہ لوگ بہت سنبھال کر رکھتے ہیں، زمانے کی گرم سرد ہواؤں سے بچا کر۔ اسی لیے وہ ان سب باتوں سے ڈرتی ہے۔''

''اب وہ بچی تو ہے نہیں جو اُن کا ہاتھ تھامے چلے گی۔''

''پھول تو وہ بن چکی ہے مگر جس باغ کا وہ پھول ہے، اس باغ کے مالی کسی کو اپنی مرضی کے بغیر اُسے توڑنے نہیں دیں گے۔''

''پھول تو آپ بھی ہیں۔'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''کہاں وہ نازک پھول اور کہاں میں۔ بالکل جنگلی پھول۔''

''یار، میرے پھول سے تیرے پھول کا کیا مقابلہ۔ مجھے تو جنگلی پھول پسند ہے جو ہر موسم میں کھلا رہتا ہے۔'' پربھات ہم دونوں کی باتیں سن کر بول اُٹھے۔

''اگر بھگوان نے ایک موقع دیا تو تم دونوں کو دکھادوں گا کہ نازک پھول کس طرح جنگلی پھول بنتا ہے۔''

آخر سلیل کی کوششیں رنگ لائیں۔ ہماری شادی کے دوران سلیل کو موقع مل گیا۔ اُسے تنہا سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر وہ بھی پریتی کے پیچھے ہولیا اور جیسے ہی وہ برآمدے سے ہوکر کمرے میں داخل ہونے لگی، اُس نے کلائی تھام کر اُسے دوسری طرف کھینچ لیا۔ خوف سے جیسے اُس کے حلق سے چیخ نکلنے لگی، تو سلیل نے اُس کا منہ اپنے ہاتھوں سے بند کر دیا۔

''پریتی، میں ہوں سلیل، مجھے معلوم ہے تمھیں چیخنا بہت اچھا آتا ہے۔'' اور اُس نے اپنے دونوں ہاتھ کھینچ کر اُسے آزاد کر دیا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟ مجھے اس طرح کا مذاق بالکل پسند نہیں۔ ہٹو میرے راستے سے۔'' غصے سے تمتماتے ہوئے پریتی نے کہا۔

''میں بھی آج فیصلہ کرنے ہی آیا ہوں کہ یا تو تم اقرار کرو یا انکار۔''

''کس بات کا؟'' پریتی نے کہا۔

''انجان مت بنو۔ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں کیا بات کہہ رہا ہوں۔ اب یہ آنکھ مچولی کا کھیل مجھ سے اور نہیں کھیلا جاتا۔'' پریتی خاموش نظریں جھکائے کھڑی رہی اور وہ اُس کے جواب کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا۔

''پریتی، ہاں یا نا؟''

وہ پھر خاموش رہی۔

''مجھے جواب چاہیے ہاں یا نہیں۔ اور اگر اب بھی زبان نہیں کھولی تو چھت سے ابھی تمھاری آنکھوں کے سامنے کود پڑوں گا۔ ہاں یا نہیں؟''

''ہاں، ہاں، ہاں۔''

اُس کا جواب سنتے ہی وہ خوشی سے جھوم اُٹھا اور پریتی شرم سے منہ چھپائے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

ہماری شادی کے ایک ماہ بعد اُن دونوں کی شادی بھی ہوگئی۔ ابّو نے کپور انکل کو جس طرح سے اس شادی کے لیے راضی کیا، یہ تو وہی جانتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا جانتے تھے کہ اگر سلیل کو پریتی نہ ملی تو وہ زندگی بھر کنوارا رہے گا اور کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ اُس کی ایسی حالت دیکھ کر ہم سب اس کی شادی کرانے میں جٹ گئے۔ اُن کی شادی ہوئی تو ہمارے سر سے بھی ایک بوجھ اُتر گیا۔

سلیل کو دہلی میں نوکری مل گئی اور پربھات نے کینیڈا جانے کا فیصلہ کرلیا۔شادی کے بعد ہم دونوں سہیلیاں اپنی اپنی گھر گرہستی سنبھالنے میں مصروف ہوگئیں۔ابوّ کی بیماری کے بعد ماں اورابو کو بھی ہم اپنے ساتھ کینیڈا لے گئے۔اس طرح اب سلیل اور پریتی سے بات صرف فون پر ہوتی تھی۔جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، ذمے داریاں بڑھتی گئیں اوراپنے لیے وقت کم ہوتا گیا۔

آج، ابوّاور ماں کے انتقال کے بعد ہندوستان سے جو تھوڑا بہت ناطہ رہ گیا تھا، وہ بھی ٹوٹتا جار ہا تھا۔وہاں جو کچھ جائداد ابوّ نے میرے نام کررکھی تھی، اُسی کو بیچنے کے سلسلے میں مجھے اکیلے جانا پڑر ہا تھا۔پھر جب سے سلیل کے ایکسیڈنٹ کے بارے میں پتہ چلا تھا، دل ان سے ملنے کو بہت بے چین تھا۔سائٹ پر کام دیکھتے وقت سلیل کا پیر ایسا پھسلا کہ اُس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اوراُس نے بستر پکڑلیا۔مجھے ایک ہی پریشانی کھائے جارہی تھی کہ نہ جانے پریتی کا کیا حال ہوگا، اسے تو کچھ بھی اپنے آپ کرنا نہیں آتا۔پھر وہ سب کس طرح دیکھتی ہوگی۔ بچے کی دیکھ بھال، شوہر کا خیال۔شاید اجے اور وجے بھیّا اس کی مدد کرتے ہوں گے۔اتنا لمبا سفر کس طرح پرانے دنوں کو یاد کرکے گزرگیا، پتہ ہی نہ چلا۔

رات کے تقریباً دو بجے فلائٹ ہندوستان پہنچی۔پلین سے نکل کر میں نے کھُلی ہوا میں ایک لمبی سانس لی جیسے اپنے ملک کی ہوا اپنے اندر سمونے کی کوشش کررہی ہوں۔اجے اور وِجے بھیّا کو میری نظریں تلاش کرنے لگیں مگر سامنے پریتی کو اِدھر اُدھر دیکھتے پاکر میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔نظر پڑتے ہی وہ لپک کر ملنے آئی۔ایک عمر کے بچھڑے آپس میں گلے ملے تو آنکھیں بھی بھر آئیں اور باتیں جو شروع ہوئیں تو ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔گھر پہنچنے تک ہم اپنے دل کا کافی غبار نکال چکی تھیں۔ایئر پورٹ سے گھر تک کے سفر میں حیران کن بات یہ تھی کہ پریتی اتنی رات گئے اکیلی خود گاڑی چلا کر مجھے لینے آئی تھی۔جب میں نے اجے اور وجے بھیّا کے بارے میں پوچھا تو ایک لمبی سانس لے کر بولی۔

''سب کی اپنی اپنی ذمّے داریاں ہیں۔اپنی زندگی ہے۔وقت ہی کس کے پاس ہے کسی کے لیے۔''

سلیل سے مل کر دل کو تسلی ہوئی۔میں تو سوچتی تھی کہ اتنی بڑی مصیبت نے اسے توڑ دیا ہوگا۔نہ جانے اس کا مزاج کیسا ہوگا۔مگر خوشی ہوئی کہ اب بھی اس کی ہنسی برقرار تھی۔بستر پر لیٹے لیٹے بھی وہ مذاق کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔اُن کی بیٹی بالکل پریتی کا دوسرا روپ تھی۔

وہی شکل، وہی خلوص، وہی پیاری پیاری باتیں۔

''آنٹی، ممّی آپ کی بہت ساری باتیں سناتی ہیں۔ میں آپ کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں۔''

''کیا کیا سناتی ہیں تمھاری ممّی، مجھے بھی تو کچھ پتہ چلے۔''

''آپ کے بچپن کی باتیں۔ کس طرح ممی کے لیے آپ دوسرے بچوں سے لڑا کرتی تھیں۔ آپ کے ڈر سے کوئی بھی ممّا کو کچھ نہیں کہتا تھا۔ ممّی کہتی ہیں مجھے آپ جیسی بننا ہے۔''

''مجھ جیسی! وہ کیسے؟''

''آپ جیسی بہادر، آپ جیسی خوش مزاج اور......''

گوری کو بیچ میں ٹوک کر میں نے کہا۔ ''بس بس، بہت ہو گیا۔ تم نہ میرے جیسی بننا اور نہ اپنی ممّا جیسی، صرف اپنے جیسی بننا۔'' میں نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''آنٹی، پاپا ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟ جب سے پاپا نے بستر پکڑا ہے، ممی کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ پاپا بھی اُداس اُداس رہتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک ہو جائیں گے تمھارے پاپا۔ تمھارے انکل نے کینیڈا میں بہت بڑے ڈاکٹر کو آپ کے پاپا کی رپورٹیں دِکھائی ہیں۔ تمھیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اسی لیے تو آئی ہوں میں۔''

سلیل خاموشی سے ہم دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

''ماما، تم اپنا کام پہلے مکمل کر لو۔ پھر ہمارے جانے کی تیاریاں کرنا۔''

''اتنا وقت کہاں ہے ہمارے پاس۔ وہاں بھی پربھات اور پرشانت کو پریشانی ہو رہی ہوگی۔'' مجھے اب باپ بیٹے کی فکر ہونے لگی تھی۔ اتنے دن تو میرے بغیر کبھی نہیں رہے تھے۔

میرا کام تو پورا ہو گیا تھا مگر ان لوگوں کے جانے کے کاغذات تیار نہیں ہو پا رہے تھے۔ پریتی اور سلیل کا ویزہ تو لگ گیا مگر ینیتا کا ویزہ ابھی نہیں لگ رہا تھا۔ اُدھر میری واپسی کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ ٹکٹ بڑھا لوں مگر پریتی کا کہنا تھا کہ مجھے چلے جانا چاہیے۔ وہ بعد میں آ جائے گی۔

''تم بیمار سلیل اور ینیتا کو لے کر کیسے آؤ گی۔ یہ تمھارا پہلا ٹرپ ہے۔ میں جانتی ہوں تمھیں۔ بس ہم ساتھ چلیں گے۔''

''تم بلاوجہ فکر کر رہی ہو۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔ اب میں پہلے والی پریتی نہیں ہوں۔''

''وہ تو میں نے دیکھ لیا کہ تم بدل گئی ہو مگر اتنی بھی نہیں۔''

اتنے میں بیتا کی زور زور سے چلاّنے کی آوازیں سن کر ہم دونوں سلیل کے کمرے کی طرف بھاگیں۔ بستر پر سلیل کے پیروں کے پاس چھپکلی بیٹھی تھی اور گوری اُسے دیکھ کر کمرے کے کونے میں دُبکی کھڑی تھی۔

''کیا ہوا۔ چلاّ کیوں رہی ہو؟''

''وہ......وہ......'' اُس نے بستر کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے یہ دیکھتے ہی اپنے کان بند کر لیے کہ اب ماں بھی بیٹی کے ساتھ چلاّنے لگے گی۔ مگر میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پریتی نے پاس پڑی کتاب ہاتھ میں لی اور ''شی، شی'' کر کے چھپکلی کو بھگا دیا۔

''ڈرپوک کہیں کی۔'' اُس نے اپنی بیٹی سے کہا۔

سلیل چپ چاپ مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

''دیکھا نا، میں نے وہ کام کر دکھایا جو تم نہ کر سکیں۔''

دوسرے پل میں نے ٹکٹ ردّ کرانے کا فیصلہ بدل دیا اور جانے کی تیاّریاں شروع کر دیں۔ اب پریتی واقعی بدل چکی تھی۔ سلیل نے جو کہا تھا، وہ کر دکھایا تھا۔

OO

آنکھوں سے دِل تک

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ پرندے جھنڈ بنا کر اپنے اپنے گھروندوں کو واپس جا رہے تھے۔ یہ منظر ہر شام دیکھنے کو ملتا ہے۔ دن ڈھلنے پر مزدور مزدوری کر کے، آدمی نوکری کر کے اور پرندے دانا دُنکا چن کر اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔ میں باہر باغیچے میں چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے آسمان پر نظریں ٹکائے ہلکے ہلکے اندھیرے میں ان پرندوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی کہ پیچھے سے اچانک کسی نے آ کر میری آنکھیں موند لیں اور میں وہ لمس محسوس کرتے ہی اُچھل پڑی۔

''وکرم!'' خوشی سے میری چیخ نکل گئی۔

''ماں تم بھی ایک منٹ میں پہچان لیتی ہو'' گلے لگتے ہوئے اس نے پیار بھرا گلہ کیا۔

''ارے کیسے نہ پہچانوں؟ تیری نس نس سے واقف ہوں۔ جب تو میری کوکھ میں تھا تب بھی میں تیری حرکت پہچان لیتی تھی۔ پل پل بڑھتے دیکھا ہے ان آنکھوں نے تجھے۔ میرا اپنا وجود ہے، پھر کیسے نہ جانوں تجھے؟'' پیار سے اس کے بال سہلاتے ہوئے میں نے کہا۔

''فوج میں افسر ہو گیا تھا مگر ابھی تک اُس کا بچپن نہیں گیا تھا۔ بچپن میں جب کبھی باہر سے لوٹتا آتے ہی میری گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا اور ہر بار ایک ہی بات کہتا۔

''دُنیا میں سب سے زیادہ آرام دہ جگہ بھگوان نے ماں کی گود بنائی ہے۔''

''اچانک کیسے آنا ہوا؟ کل تک تو تمھارا کوئی ارادہ نہ تھا؟''

''بس دل چاہا اور دو دن کی چھٹی لے کر بھاگا چلا آیا۔ پاپا نظر نہیں آ رہے؟''

''وہ اس وقت گھر پر کہاں ٹکتے ہیں، دوستوں کے ساتھ کلب گئے ہیں۔''

''پاپا بالکل نہیں بدلے۔''

''تو ان باتوں کو چھوڑ اور یہ بتا اچانک پروگرام کیسے بنا؟''

''ماں کسی کو تم سے ملانا چاہتا ہوں۔''

''کہاں رہتی ہے؟''

''جموں میں۔''

''کیسی ہے؟''

''بہت خوبصورت، بہت اچھی ہے، مگر تم سے زیادہ نہیں۔''

''چاپلوس شریر کہیں کا۔ کب سے جانتا ہے؟''

''پچھلے تین مہینے سے۔''

''ہوں...... تبھی تو جناب گھر کا راستہ بھول گئے تھے۔ فوٹو دِکھائے گا یا ملوائے گا؟''

''فوٹو ابھی دکھاؤں گا ملاقات بعد میں۔'' اس نے جیب سے تصویر نکال کر سامنے رکھ دی۔

''واہ......!''

تصویر کیا تھی جیتی جاگتی مورت تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں، لمبے گھنے کالے بال، تیکھی ناک، نازک لب اور کشادہ پیشانی۔ ایک نظر میں دل میں اُتر جانے والی لڑکی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں چمک نہیں تھی۔ اُداس ویران آنکھیں نہ جانے کیا تلاش کرتی نظر آ رہی تھیں۔

''نام کیا ہے؟''

''وندنا — پسند آئی ماں!''

''بہت خوبصورت ہے۔ چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس عمر میں شوخی کے بجائے اُس کی آنکھوں میں ویرانی کچھ جچ نہیں رہی۔ زندگی سے بیزار لگ رہی ہے۔'' میں نے ایک بار پھر تصویر کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس چاند میں بھی ایک داغ ہے ماں۔'' وکرم نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا......؟''

''وندنا بیوہ ہے۔''

''نہیں۔'' میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''دو مہینے ہوئے تھے اس کی شادی کو کہ اپنے پولیس افسروں نے اُس کے پتی کو دہشت گرد

سمجھ کر مار دیا۔ رات کے وقت وہ کسی مریض کو دیکھ کر لوٹ رہا تھا اور پولیس کسی دہشت گرد کا پیچھا کر رہی تھی غلطی سے اسے دہشت گرد سمجھ لیا گیا۔ وہ سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ بعد میں شناخت ہوئی تو ان افسران کو معطل کر دیا گیا۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بے گناہ تو جان سے جاتا رہا اور اس کی دلہن، جس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اُتری تھی لوٹ کر مائیکے آ گئی۔ میرے ساتھ جو میجر تواری ہیں ناں، انھیں کی چھوٹی بہن ہے۔''

میری خاموشی کا اس نے غلط مطلب نکالا۔

''تم خاموش کیوں ہوگئیں ماں؟ اس میں تو اس کا کوئی قصور نہیں۔ کیا بیوہ کو جینے کا حق نہیں؟''

اور میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وندنا کے بارے میں جان کر جو دل میں ٹیس اُٹھی وہ آنکھوں کے ذریعے بہہ گئی۔ میری سسکیوں کی آواز سن کر میری ماں اُٹھ بیٹھی۔ جھنجھوڑ کر اس نے مجھے ہلایا اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ میں اپنے کمرے میں اپنے ہی بستر پر سو رہی تھی اور ماں میرے پاس حیرت اور پریشانی کی حالت میں مجھ سے سوال کیے جا رہی تھی۔ آنسوؤں سے تکیہ بالکل بھیگ چکا تھا۔

''کوئی بُرا خواب دیکھا ہے کیا؟ کیوں اس طرح رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی؟''

''ہاں ماں'' میں نے ایک لمبی سانس لے کر جواب دیا۔

''رونا کیسا؟ سو جا خواب تو خواب ہوتا ہے۔ تو ٹھیک تو ہے نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں آپ آرام کریں۔'' ماں نے لائٹ پھر سے بجھا دی اور میں پھر سو نہ سکی۔ خواب کا ایک ایک منظر ذہن میں گھومنے لگا کڑی سے کڑی جڑتی گئی اور زخم پھر سے ہرے ہو گئے۔

میری اور راجیو کی پہلی ملاقات میری سہیلی اوما کی شادی میں ہوئی تھی۔ راجیو اوما کے بھائی کے ساتھ ایئرفورس میں پائیلیٹ تھا۔ شادی سے ایک روز پہلے گانوں کا پروگرام تھا سبھی عورتیں سہاگ کے گیت گا رہی تھیں اور لڑکیاں مذاق کر رہی تھیں۔ لڑکوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ کھڑکیوں سے چوری چھپے اندر کا نظارہ کر رہے تھے۔ جب بھی کوئی لڑکا کمرے میں

گھسنے کی کوشش کرتا گھر کی کوئی نہ کوئی بڑی بوڑھی عورت جھٹ اسے ٹوک دیتی۔

''اے لڑکو! عورتوں میں تمھارا کیا کام، بھاگو یہاں سے۔''

جیسے ہی لڑکیاں ناچنے کو اٹھیں کھڑکیوں پر بھیڑ بڑھ گئی۔ لڑکیوں کا جوش دیکھ کر میں نے بھی ڈھولک کی تھاپ، تیز کر دی۔ موقع ملتے ہی لڑکے بھی اندر گھس آئے اور ساتھ میں ناچنے لگے۔ ایک لڑکا دیوار سے لگ کر کھڑا صرف میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ جھینپ گیا اور اس سے نظر ملتے ہی میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شاید ڈھولک کی تھاپ سے بھی زیادہ تیز۔ اسی لیے تھاپ کے مدھم پڑتے ہی لوگوں نے چلّانا شروع کر دیا۔ سب کی نگاہیں میری طرف تھیں۔ اُدھر دیوار کی طرف سے ڈھولک تیز بجانے کا اشارہ ہوا تو مجھے ایسا لگا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔ میرے جھینپنے پر وہ مسکرا دیا۔ ڈھولک پھر سے تیز بجنے لگی اور لوگ مستی میں ناچنے لگے۔ نہ جانے کیسی کشش تھی اُن آنکھوں میں کہ بار بار نظر اُس طرف اُٹھ جاتی اور ہر بار اس کی نظروں سے ٹکرا کر لوٹ آتی۔ کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر وہاں اُس کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ وہاں صرف میں اور وہ ہی موجود ہیں۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ میری آنکھوں سے دل تک پہنچ چکا ہے۔ بات کرنے کا موقع ہم لوگوں کو اسی رات مہندی کی رسم کے بعد مل گیا۔ سب سہیلیوں کی طرح میں نے دلہن کی مہندی لگنے کے بعد اپنے ہاتھوں میں بھی مہندی لگوالی تھی۔ جب مہندی تھوڑی سوکھ گئی تو میں کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں پہنچ گئی۔ ابھی میں سوچ رہی تھی کہ کسی سے کہوں کہ مجھے کھانا پروس کر دے دے کہ میرے سامنے کھانے سے سجی پلیٹ موجود تھی۔

''جناب کی خدمت میں کھانا حاضر ہے۔''

''آپ......؟''

''ہاں میں۔ میرا نام راجیو ہے۔ ایئر فورس میں پائیلٹ ہوں۔ اور جموں کا رہنے والا ہوں۔ آج آپ نے ڈھولک بہت اچھی بجائی۔ ہاتھ تھک گئے ہوں گے۔ پھر مہندی سے دونوں ہاتھ رنگے ہوئے ہیں، اسی لیے میں نے سوچا آپ کی تھوڑی سی خدمت کی جائے۔'' اس نے پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنے لیے لائے تھے؟''

''اگر آپ اجازت دیں تو ایک سے ہی کام چل سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''دیکھیے آپ کے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے ہیں اور میرے دونوں ہاتھ خالی۔ اگر بُرا نہ لگے تو میں آپ کی مہندی خراب ہونے سے بچا سکتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ سمجھ سکتی ہیں آپ۔'' اس کے لبوں پہ شرارت کھیل رہی تھی۔

''جی نہیں۔ بہت بہت شکریہ۔ ان ہاتھوں میں صرف مہندی ہی لگی ہے ٹوٹے نہیں ہیں۔''

میں غصے سے پیر پٹختی وہاں سے چل پڑی۔

''خدا نہ کرے کبھی ایسا ہو!'' پیچھے سے آواز آئی۔

پوری شادی کے دوران پھر اس سے بات کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن آنکھ مچولی کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔ جب بھی نظر اس کی طرف اُٹھی میں نے اسے اپنی طرف دیکھتے پایا۔ جو باتیں زبان سے نہ ہو پائی تھیں وہ آنکھوں کے ذریعے ہو گئیں۔ ایک ان کہا انجانا رشتہ قائم ہو گیا ہم دونوں کے بیچ۔ اوما کی رخصتی کا وقت آ گیا۔ ہر طرف اُداسی کا منظر تھا۔ اوما اپنے والدین، بہن بھائیوں اور سہیلیوں سے گلے مل مل کر رو رہی تھی۔ سب ہی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ حالانکہ یہ آنسو خوشی اور غم کے ملے جلے آنسو ہوتے ہیں۔ میں بھی ایک کونے میں کھڑی رو رہی تھی کہ کسی نے رومال میرے آگے کر دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو راجیو تھا۔

''آپ روتی ہوئی بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ آنسو پونچھ لیجیے۔'' اور میں نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

''یہ ہوئی نا بات۔''

پھر کچھ پل خاموش رہ کر بات آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔''

''اچھا—''

''کیا اچھا؟ آپ کو کوئی فرق نہیں پڑے گا؟''

''جی نہیں، میں تو آپ کو جانتی تک نہیں پھر آپ کے جانے کا کیسا غم؟''

''میں تو تمھارے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔تم کہاں رہتی ہو، کہاں پڑھتی ہو، گھر میں کون کون ہے۔تمھاری پسند نا پسند کیا ہے؟''

''جاسوس ہیں کیا؟'' وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔مگر میں آپ سے نہیں ہٹی۔

''جی نہیں۔جن لوگوں میں مجھے دلچسپی ہو، اُن کے بارے میں جاننے کی مجھے ہمیشہ جستجو رہی ہے۔''

''باتیں اچھی بنا لیتے ہیں آپ۔شکل سے تو ایسا نہیں لگتا۔''

''شکل سے کیسا لگتا ہے۔''

''یہ کہ آپ کے منہ میں زبان نہیں ہے۔''

''دھیرے دھیرے سب جان جائیں گی اور اگر ایک بار مجھے اچھی طرح جان گئیں تو زندگی بھر نہیں بھول پائیں گی۔''

''بہت بڑی غلط فہمی کے شکار ہیں آپ۔''

''یہ غلط فہمی نہیں جناب، خود پر یقین ہے مجھے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت جھلک رہی تھی۔

اور اس کی یہ بات بالکل صحیح نکلی۔اُس دن سے لے کر آج چوبیس برس گزر جانے کے بعد بھی میں اسے بھلا نہ پائی۔زندگی نے کئی اُتار چڑھاؤ دِکھائے۔کئی رنگ بدلے۔کئی موسم آئے مگر اس دن سے لے کر آج تک راجیو ہر پل میرے ساتھ، میرے ذہن میں، میری نس نس میں پیار بن کر گھل گئے۔کبھی مجھ سے الگ نہ ہو سکے۔راجیو نے جس شدّت سے مجھے چاہا یہ اسی کا صلہ ہے کہ میں ایک پل کے لیے بھی اسے فراموش نہ کر سکی۔شادی سے پہلے کے سات مہینے اور شادی کے بعد کے دو سال ہم نے خوشیوں کے ہنڈولے میں گزارے اور اتنے تھوڑے عرصے میں ہم نے بھرپور زندگی گزار لی۔اس نے میرا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ہمیشہ مجھے پلکوں پر بٹھا کر رکھا۔میری ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کی۔میرے دل کی بات زبان تک آنے سے پہلے وہ پوری کر دیتا۔کسی کی زندگی کے لیے اتنا خاص بن جانا اچھے اچھے لوگوں کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔میرے پاؤں بھی زمین پر کہاں ٹکتے تھے۔ایک دوسرے کو پا کر ہم تو دُنیا ہی بھول گئے تھے۔میں خود کو دُنیا کی سب سے خوش نصیب عورت سمجھتی تھی۔میرے مائکے والوں کو

اس بات کا گلہ تھا کہ میں نے پلٹ کر کبھی ان کی خبر نہیں لی اور ساس کو اس بات کی شکایت تھی کہ
''شادی کے دو سال ہونے کو آئے اور تم دونوں ہو کہ بس اسی طرح گھومتے پھر رہے ہو،
تیسرے کے بارے میں سوچتے ہی نہیں۔''

''ماں اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ابھی ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ تو لیں۔''

''دو برس میں تو لوگ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں اور ایک تم ہو جو ابھی تک ایک دوسرے کو جان ہی نہیں پائے۔تم لوگوں کے لیے تو پوری زندگی بھی کم ہوگی۔'' ماں کے غصے میں پیار بھری سرزنش ہوتی۔

''یہ بات تو ٹھیک ہے ماں۔ایک جنم تو کم ہے ایک دوسرے کو جاننے کے لیے۔''

''بہو اب تو ہی کچھ سوچ میرے بارے میں، یہ تو بنا سر پیر کی کہے جاتا ہے۔''

''یہ میرے بنا کیسے سوچے گی ماں؟ کیا کر سکتی ہے یہ میرے بغیر۔''

''شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں کرتے۔''

اور پھر جس روز راجیو کو معلوم ہوا کہ وہ باپ بننے والے ہیں اس دن سے دادی اماں کی طرح ڈھیروں ہدایتیں دے ڈالیں۔

فون پر ساسو ماں ہدایتیں دیتی اور ادھر راجیو۔اور جب کسی بات پر اڑ جاتے تو ہار ماننے کا نام ہی نہ لیتے۔

''تم مجھ سے شرط لگالو کہ ہمارے یہاں بیٹا ہی ہوگا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''تمھاری چال ڈھال، تمھارا کھانا پینا سب بتاتے ہیں۔'' اُس نے تجربے کار بوڑھی عورت کی طرح کہا۔

''کسی دائی کے یہاں کام تو نہیں کیا؟''

''بات بدل رہی ہو۔بولو لگاتی ہو شرط؟''

''تمھیں لڑکا چاہیے کیا؟''

''چاہیے تو بیٹی بالکل تمھاری جیسی مگر ہوگا بیٹا ہی۔میں نے تو نام تک سوچ لیا ہے۔''

''کیا......؟''

''وکرم۔''

''بہت پُرانا نام ہے۔کوئی اور سوچو اچھا سا نام۔لڑکی کا بھی سوچ لینا۔''

''لڑکی کا اگلی بار سوچیں گے اس بار تو بیٹا ہی ہوگا۔وکرم بہادر بنے گا اپنے باپ کی طرح۔میں تو اسے فوج میں بھیجوں گا۔''

''باپ رے باپ، آپ تو شیخ چلّی کے بھی باپ نکلے۔''

''وکرم کا نام شیخ چلّی ہرگز نہیں رکھوں گا۔''اور ہم دونوں قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

''بہت تیز رفتار ہے آپ کے سوچنے کی۔''

''پائیلٹ جو ہوں۔تیز پرواز میری فطرت بن گئی ہے۔''

نہ جانے وہ تیز پرواز تھی یا میری بدقسمتی۔وکرم کو ابھی اس دُنیا میں آنے میں چار مہینے باقی تھے کہ ایک روز راجیو ڈیوٹی پر گئے اور لوٹ کر نہ آئے۔بس اتنی خبر ملی تھی کہ کہرے کی وجہ سے ہوائی جہاز پہاڑ سے ٹکرا گیا اور کریش ہو گیا۔جہاز کے ٹکڑے گہری کھائی میں بکھر گئے۔جہاز سے کچھ فوجی بھائیوں کے لیے سرحد پر ضروری سامان جا رہا تھا۔چھ کے چھ آدمی لاپتہ ہو گئے۔کسی کی بھی لاش نہ ملی۔ایک ہی پل میں میری ہنستی کھیلتی دُنیا اُجڑ گئی۔یہ خبر ملتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ہوش گم ہو گئے اور ساری کائنات گھومتی سی لگی۔جب ہوش آیا تو خود کو اسپتال میں پایا۔صدمہ اتنا گہرا تھا کہ وکرم سے بھی برداشت نہ ہو سکا،اس نے بھی اپنے پاپا کے بغیر اس دُنیا میں آنے سے انکار کر دیا۔ایک میں ہی سخت جان ڈھیٹ تھی جسے اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا۔میری دُنیا ویران ہو گئی۔میری گود سونی ہو گئی مگر میرے دل نے یہ کبھی قبول نہ کیا کہ راجیو ہمیشہ کے لیے وکرم کو ساتھ لے گئے ہیں اور میں تنہا ہو گئی ہوں۔آج چوبیس برس گزر جانے کے بعد بھی میں نے ہر پل وکرم کو محسوس کیا ہے۔میں نے اسے پروان ہوتے دیکھا ہے۔کبھی بھی، کسی دن، کسی پل راجیو مجھ سے جدا نہ ہوئے۔یہ بات صحیح ہے کہ جسمانی طور پر وہ مجھ سے بہت دُور تھے، میں انھیں چھُو نہیں سکتی تھی،ان کی بانہوں میں جو سکون ملتا تھا، وہ اب نصیب میں نہ تھا مگر میں ان کی موجودگی ہمیشہ محسوس کرتی تھی۔لوگوں کی نظروں میں میں تنہا تھی مگر میں تنہا کبھی نہیں ہوئی۔جب راجیو کے لاپتہ ہونے کی خبر ملی تب بھی مجھے یقین تھا کہ وہ زندہ ہیں اور جب سب ہار گئے اور اتنے برسوں بعد سب نے انھیں مرا ہوا سمجھ لیا

تب بھی مجھے یہ گمان نہ ہوا۔لوگوں کی نظر میں میں شاید پاگل ہوگئی تھی جو اکیلے میں اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھی، ہنستی رہتی تھی۔ان کے پاس میری نظر نہیں ہے۔انھیں وکرم اور راجیو نظر نہیں آتے۔انھوں نے کبھی باپ بیٹے کو نہ لڑتے دیکھا ہے نہ پیار کرتے۔کبھی بیٹے کی ضد اور باپ کالاڈ بھی نہیں دیکھا۔راجیو کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ اس خوبصورت وادی میں اپنا ایک چھوٹا سا گھر ہونا چاہیے۔کمرے بے شک دو تین ہی کیوں نہ ہوں۔مگر لان بڑا ہونا چاہیے تاکہ لان میں بیٹھ کر ان خوب صورت وادیوں کا نظارہ کیا جا سکے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے خوابوں کا گھر جسے ہم تعمیر نہ کر سکے تھوڑے دنوں بعد میرے خوابوں میں آجاتا ہے۔سپنے بدلتے رہتے ہیں مگر گھر وہی ہوتا ہے۔وہی کمرے وہی دالان، وہی باغیچہ۔وکرم کی شکل ہو بہو اپنے پاپا پر گئی ہے۔قد و قامت میں بھی وہ ان سے کم نہیں۔وہ گھر بالکل مکمّل ہے۔اس گھر میں سنّاٹا نہیں، قہقہے گونجتے ہیں۔اس گھر میں تنہائی نہیں رونق بستی ہے۔یہ گھر ریت اور اینٹوں سے نہیں بلکہ سپنوں، حسرتوں، آرزوؤں اور محبتوں سے بنایا گیا ہے۔اس گھر کی بنیاد عشق پر مبنی ہے اور عشق نام ہے فنا کا۔

ہندو گھرانے کی لڑکیاں بہت کم اُردو زبان و ادب کی طرف راغب ہوتی ہیں۔ رینو جی نے نہ صرف اُردو پڑھی بلکہ اس میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اس سے ایک قدم اور آگے اُنھوں نے اظہارِ ذات کے لیے اُردو افسانہ کا انتخاب کیا۔ اُنھوں نے زندگی کے اپنے تجربات و مشاہدات کو افسانوں کا رُوپ دینے کی اچھی کوشش کی ہے —— رینو بہل مکمل طور پر باغی عورت تو نہیں لیکن اپنی شخصی آزادی، سماجی برابری اور الگ پہچان کے لیے ''ورکنگ وومین'' کے رُوپ میں زندگی گزارنے میں یقین رکھتی ہیں۔ گھریلو فضا اور دفتر کے تقاضوں نے اُنھیں دیکھنے، سوچنے اور سمجھنے کا ایک نیا انداز دیا ہے جو اُن کی کہانیوں میں بار بار اُبھر کر سامنے آتا ہے، جہاں اُن کے نسوانی کردار ممتا، محبّت، خلوص، ایثار کا لافانی جذبہ رکھتے ہیں، وہیں ذہنی، اقتصادی اور سماجی آزادی کے لیے کوشاں بھی ہیں۔ اُن کے نسوانی کردار متوسّط طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہیں جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ روایات اور سماجی پابندیوں کی پاسداری بھی لازمی ہوتی ہے۔ متوسّط طبقہ کی زندگی اپنی کچھ مجبوریوں کی بنا پر دھیمی چال سے چلنے والی ندی کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں اُتار چڑھاؤ اور طوفان کم ہی ہوتے ہیں۔ رینو جی کی یہ کہانیاں بھی دھیمی چال سے چلتی ہیں —— ایک طے شدہ منزل کی طرف۔ یہ نہ تو شور مچاتی ہیں، نہ ٹرک بھڑک سے کام لیتی ہیں۔ اسی لیے یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں زندگی کے نزدیک رہتی ہیں۔ یہ کہانیاں کسی نہ کسی طرح ''عورت'' کے گرد گھومتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ مصنّفہ خود ایک عورت ہے —— مصنّفہ بار بار اس امر کا احساس دلاتی محسوس ہوتی ہے کہ عورت کا غلط قدم اُسے تباہی کے اندھے غار میں جھونک دے گا۔ یہ کہانیاں ایک صالح اور ایماندارانہ پیغام دیتی ہیں۔

—— شرون کمار ورما